سلسلہ اشاعت امامیہ مشن۔ لکھنؤ نمبر ۳۶

از

سرکار سید العلماء الحاج مولانا السید علی نقی النقوی مجتہد العصر دام ظلہ

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس۔ لکھنؤ

قیمت :- چھ روپیہ

تعارُف

اس کے پہلے مشن سے واقعات کربلا کے متعلق مسلسل تین کتابیں شائع ہوئی تھیں، "مجاہدہ کربلا"، "معرکۂ کربلا"، اور "محاربۂ کربلا"۔ جو عرصہ دراز سے نایاب ہو چکی تھیں، اس مرتبہ کی اشاعت میں مناسب معلوم ہوتا تھا کہ ان تینوں کتابوں کو متحد کر کے شائع کر دیا جائے تاکہ ایک مکمل کتاب ہو جائے۔ اس کے ساتھ بعض اہل الرائے کا اصرار ہوا کہ اس میں "حسینؑ اور اسلام" کو جو مشن کے مقبول ترین رسالوں میں ہے اور جس کے دنیا کی بہت سی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور رسالہ "اسیری اہل حرم" بلکہ اس کے علاوہ کتاب "مظلوم کربلا" کو بھی شامل کر دیا جائے تاکہ اپنے موضوع پر یہ بالکل مکمل حیثیت اختیار کر لے۔ مگر یہ کام بغیر مصنف کی کاوش قلمی کے نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ سرکار سید العلماء مدظلہٗ سے عرض کیا گیا۔ ممدوح نے تسلسل کے لیے بہت سے اہم اضافوں کے ساتھ "حسینؑ اور اسلام" کے بہت سے اہم اجزا کو تو اس رسالہ میں داخل فرما دیا مگر "اسیری اہل حرمؑ" کی ساخت اور طرز تحریر کے بالکل علیحدہ ہونے کی وجہ سے اُس کو اس کتاب کے اندر داخل کرنا ممکن نہیں معلوم ہوا تو اسے بطور ضمیمہ آخر میں شامل کیا جا رہا ہے ——— اور تکمیل فائدہ کے لئے آخر میں ایک رسالہ "اہل حرمؑ کی رہائی" جو علامہ کامونپوری مدظلہٗ کا تحریر کردہ ہے ضمیمہ دوم کے طور پر اس کے ساتھ ملحق کیا جا رہا ہے جس کے بعد واقعہ کربلا کی تمام کڑیاں یکجا ہو جاتی ہیں۔

اُمید ہے کہ افراد دینی اس کتاب کا شایان شان خیر مقدم کریں گے تاکہ پھر ہم مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کی طرف متوجہ ہو سکیں۔

محرم الحرام ۱۳۹۲ھ ——— خادم ملت: سید ابن حسین نقوی عفی عنہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سیّد المرسلین
وآلہ الطیّبین الطّاھرین،

چند تمہیدی تبصرے

اور

تعارفات

(۱)

بہت ایسے ہیں جو محرّم کے موقع پر حسینؑ حسینؑ کی آوازیں سُنتے ہیں، کچھ اخباروں کے مخصوص شماروں پر محرّم میں حسینؑ نمبر لکھا دیکھتے ہیں مگر جانتے نہیں کہ حسینؑ کون ہیں؟ یا وہ کچھ لوگوں یا ایک بہت بڑے مجمع کو ننگے سر، ننگے پیر سڑکوں پر یا کسی گھوڑے کو بھی اس شان سے دیکھتے ہیں کہ

باگیں کٹی ہوی ہیں، خون کے سے سُرخ دھبّے جا بجا اُس کے اوپر ہیں اور جسم پر جا بجا جیسے تیر پیوست ہیں یا کسی تابوت کو سُرخ خون آلودہ طرح کی چادر سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں اور اکثر اس کے ساتھ اُنھیں رونے کا شور بھی سنائی دیتا ہے مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس کی یاد تازہ کی جاتی ہے اور بہت ممکن ہے اور یقیناً بہت ایسا ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی کی بنا پر اُن کا دل ان غم انگیز مناظر کو دیکھ کر متاثر بھی ہوتا ہو اور اُن کے ذہن میں جستجو بھی پیدا ہوتی ہو کہ یہ حسینؑ کون تھے جن پر آج تک اس طرح ماتم ہوتا ہے ــــــــ ؟!

ان کے لئے ضرورت ہے کہ اُس حسینؑ کا جس کا یہ نام سُنتے ہیں ان سے تعارف کرایا جائے اور بتایا جائے کہ وہ جلوس عزا، وہ ایک انوکھی طرح کا گھوڑا اور وہ تابوت وغیرہ کس کی یاد کو تازہ کرنے کا ذریعہ ہے اور وہ رونے کا کہرام جو انھوں نے سُنا تھا کس کے غم کے اثر سے ہے؟

اس کے علاوہ وہ خاص واقعہ جس کی اہمیت اُس کی اس پائیداری یادہی سے ظاہر ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے قائم ہے کیا تھا اور کس بنا پر ہوا تھا۔؟

یوں تو گھری نظر سے دیکھا جائے تو جو حضرت حسین

بن علی علیہما السلام کے نام کا ورد رکھتے ہیں اور آپ کے ذکر کا دن رات مشغلہ رکھتے ہیں، اُنھیں بھی اکثر و بیشتر آپ کی عظمت کا پورا تصوّر اور آپ کے اس کارنامۂ جاوید کی گہرائیوں کا کامل احساس نہیں ہے۔ اس لیے وہ خود محتاجِ تعارف ہیں مگر یہ پہلو تعارف کا وہ ہے جس کا حق اُسی وقت ادا کیا جا سکتا ہے جب تعارف کرنے والا خود اس حیثیت سے معرفتِ حسینؑ کا جوہر رکھتا ہو لیکن یہ دعوی کرنا مادّی ماحول میں گھرے ہوئے ایک آدمی کے لیے کوئی آسان بات نہیں ہے۔

بہر حال یہ ایک مشکل مرحلہ ہے جس کے طے کرنے کی اس وقت میں اپنے میں طاقت محسوس نہیں کرتا، نہ اس محدود کتاب کا تنگ ظرف اس کی وسعت کے لیے کفایت کر سکتا ہے۔[۱]

سردست یہ تعارف اُنہی افراد کے لئے ہے جو اس ذات سے تقریباً بالکل ہی ناواقف ہیں۔[۲]

---

[۱] جو زیادہ بسط و تفصیل کے طلبگار ہوں وہ "شہید انسانیت" کا مطالعہ فرمائیں جو "ادبستان" دین دیال روڈ لکھنؤ[۳] سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

[۲] اس کتاب میں کچھ وہ اجزا آ گئے ہیں جو تفصیل کے ساتھ "شہید انسانیت" میں موجود ہیں، اس لئے اس کتاب کو "شہید انسانیت" کا تقریباً خلاصہ سمجھا جا سکتا ہے۔

نسب

پیغمبروں میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی وہ بڑی ہستی ہے جس کی عظمت و جلالت پر یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب متفق ہیں۔

ان کے دو بیٹے اسحٰقؑ اور اسماعیلؑ تھے۔ حضرت اسحٰقؑ سلسلۂ بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے جن میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دو بڑے پیغمبر ہوئے اور توریت اور انجیل اور زبور کتابیں نازل ہوئیں، اور حضرت اسماعیلؑ اُن کے والد بزرگوار نے شیر خوارگی کے عالم میں اُن کی والدۂ گرامی جناب ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہونچا دیا جہاں انہی باپ بیٹے حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے ازسرنو خانۂ کعبہ کی یہ تعمیر کی جو آج تک قائم ہے۔

جناب اسماعیلؑ کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہوئے اور ان کی نسل میں ایک کے بعد ایک نضر بن کنانہ اور فہر بن مالک اور قصی بن کلاب وہ نمایاں افراد ہوئے جن کی نسل قریش کے لقب سے مشہور ہوئی۔

قریش میں جناب ہاشم کو بڑی عزت و شہرت حاصل ہوئی اور اس لئے بنی ہاشم اعزاز خاص کے مالک ہوئے جن کے مقابلہ میں اُن کے بھتیجے امیہ بن عبدالشمس نے جو بنی اُمیہ کا مورث اعلیٰ تھا شکست کھائی اور جلاوطن ہو کر شام میں جاکر

اپنا مستقر بنایا۔

پھر ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب نے شہرت اور عزت میں اور زیادہ ترقی کی یہاں تک کہ سیدالبطحاء کے خطاب سے مشہور ہوئے جو ان کی اولاد میں باقی رہ گیا اور ان کی نسل سادات کے لقب سے ملقب ہوئی۔

عبدالمطلب کے دس بیٹوں میں سے دو بیٹے عبداللہ اور ابوطالب تھے جو ایک ہی ماں کے بطن سے تھے۔ عبداللہ کے فرزند پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوطالب کے فرزند حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام تھے۔ حضرت محمد مصطفےٰؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ تھیں جن کا عقد حضرت علی مرتضیٰؑ سے ہوا اور ان ہی دونوں مقدس اور بزرگ ماں باپ سے دو۲ فرزند پیدا ہوئے، ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ جن کا نام محرّم میں اور اس کے بعد برابر سنائی دیتا ہے تمام مسلمان فرزند رسولؐ ہونے کی حیثیت سے اور آپ کے ذاتی فضائل و کمالات کی بناء پر آپ کی تعظیم و تکریم پر متفق ہیں اور خصوصیت کے ساتھ شیعہ مسلمان آپ کو تیسرا امام یعنی پیغمبر خداؐ کا تیسرا جانشین اور رسولؐ کے بعد خدا کی طرف کا مقرر کیا ہوا تیسرا رہبر دین مانتے ہیں۔

پیدائش، بچپنا اور تربیت

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھرانے سمیت مکہ کی سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ آئے اور یہیں بس گئے۔ "ہجرت" اسی کا نام ہے۔ اس ہجرت کے تیسرے برس حسینؑ دنیا میں آئے، اور سات برس تک اپنے نانا رسولِ خداؐ کی پرورش میں رہے۔

اب حضرت پیغمبر خداؐ کی وفات ہو گئی اور چند ہی مہینے کے بعد حسینؑ اپنی والدۂ گرامی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سایۂ عاطفت سے بھی جدا ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کا بچپنا اور شباب کا بہت بڑا دور آپ کے والد بزرگوار حضرت علی مرتضیٰؑ کے زیر سایہ گزرا اور یہ پورا دور وہی ہے جس میں تاریخ اسلامی نے بڑے بڑے پلٹے کھائے ہیں اور جن میں اُن اسباب کی داغ بیل پڑی ہے جن کے نتیجہ میں آپ کو اپنی زندگی کا آخری کارنامہ انجام دینا تھا۔

اخلاق و اوصاف

اس اعلیٰ تربیت کے ساتھ آپ حسن فطرت اور خالق کی طرف کے اُن وہبی عطیات کے حامل تھے جو اُس کی جانب کے خاص افراد کو جو رہنمائی خلق کے لئے پیدا ہی کئے جاتے ہیں خاص طور پر عنایت ہوتے ہیں۔ پھر آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے

ایسے دور سے گزرنا پڑا جو عام نظام اسباب کے ماتحت بھی ایک انسان کی پختہ کاری، تدبّر اور استقلال کے استحکام کا سبب ہوتے ہیں۔

آپ اُن اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ کا مکمل نمونہ تھے جو خلائق میں ہر دلعزیزی کا سبب ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ فیاض تھے جو خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کی فکر رکھتے تھے۔ عالم تھے جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ رحمدل تھے ایسے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھا جاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ ان اوصاف کے مظاہرے آپ سے اُن ہنگامہ خیز حالات میں بھی ہوئے جب کسی دوسرے انسان کے ہوش و حواس بجانہ رہیں جن کا تذکرہ "مجاہدہ کربلا" کے ماتحت اسی کتاب میں آئے گا۔

آپ نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی کی حیثیت سے بھائی کی اطاعت کی اور پھر بحیثیت ایک حاکم کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ اُن کے نظم قیادت کی مثال نہیں مل سکتی۔

آپ کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ

اتنے سخت اور دُشوار گزار معرکۂ عمل کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے آپ نے اپنے ساتھ لیا، اُن میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یکجان و یک دل ہو کر آپ کے مقصد کے لیے کوشاں رہے یہاں تک جانیں قربان کر دیں۔

غرض کہ آپ کے واقعات حیات آپ میں ایسے صفات کا ثبوت دے رہے ہیں جو آپ کا دنیائے انسانیت کے لیے ایک کامل معیاری نمونہ ہونا ثابت کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذکر میں جاذبیت صرف اس بناء پر نہیں ہے کہ آپ بے گناہ قتل ہو گئے اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہر انسان کی فطرت ہے بلکہ آپ کے اوصاف و کمالات جو آپ کے واقعات سے ظاہر ہیں تمام انسانی برادری کے دلوں کو آپ کی طرف موڑتے ہیں اور ہر باخبر اور کشادہ دل انسان مجبور ہے کہ وہ حسینؑ کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور آپ کی عظمت کا اعتراف کرے۔

(۲)

کربلا

یہ ملک عراق عرب میں اب ایک شہر ہے جہاں ریل پر

بصرہ سے حلّہ ہوتے ہوئے پہونچتے ہیں اور بغداد سے موڑ
جاتے ہیں۔ پھر اس کے آگے موٹر پر کوفہ اور نجف
تے ہیں۔

کربلا اس شہر کی زمین کے اُس خاص ٹکڑے کا نام تھا
س پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے جا کر اپنے خیمے
ئے تھے۔ پھر وہیں دشمنوں کی فوجوں نے آ کر آپ کا
محاصرہ کیا۔ وہیں جنگ ہوئی اور حسینؑ نے اپنی قربانی
ی کی اور وہیں ان شہیدان راہ خدا کے لاشے دفن
ے ـــــــ پھر روضے بنے اور آج وہ اطراف واکناف
الم کے لوگوں کی زیارت کا مرکز ہے۔

زمین کے اس حصّہ کے آس پاس اُس وقت بہت سے چھوٹے
وٹے زمین کے ٹکڑے تھے جن میں کسی کا نام غاضریہ تھا، کسی کا
بیعہ اور کسی کا نینوا۔

وہ تمام مقامات غالباً اب اس شہر کا جزء ہو گئے ہیں جو کربلا
نام سے موسوم ہے۔

چونکہ حضرت امام حسینؑ نے حق کا یہ جہاد اسی سرزمین
ا اس لیے ہم اُسے "مجاہدۂ کربلا" کہتے ہیں جو اس کتاب
نے نام قرار دیا ہے

(۳)

اسلام

جس طرح حسینؑ کا نام تقریباً ہر آدمی نے ضرور سُنا ہوگا
اسی طرح دنیا میں کوئی تعلیم یافتہ آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اس
کا نام نہ سنا ہو۔

حقیقت کے لحاظ سے اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔ د
خدا کے سامنے پورے طور پر سر جُھکانا اور اُس کے پیغام کو قبو
کرنا ہے۔ اس لیے ازل سے جو صحیح معنی میں دین ہے وہ اسل
ہی ہے اور سب پیغمبر خداؑ کی طرف سے اسی دین کی اشاعت کے
آئے۔ مگر اس دین کا نام اسلام اور اُس کے پیرؤوں کا نام مُسلم
سب سے پہلے خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ نے رکھا اور اس اعتبا
سے وہ فرزندان اسلام کے مورث اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں
اور آخر میں اس دین کو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جو آل ابراہیم میں سے اُن کے حقیقی وارث تھے اتنی تکمیل وتش
کے ساتھ پیش فرمایا کہ عام طور سے دنیا آپ ہی کو بانی اسلام
لقب سے یاد کرنے لگی۔

اسلام کا پہلا بنیادی اصول توحید ہے جس کے تحت پیغمبر اسلا
نے بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی غرض کہ غیر اللہ کی ہر طرح

پرستش کو ختم کیا اور اس طرح اسلام صرف ایک اعتقادی تصوّر
نہیں بلکہ ایک عملی نظام بن گیا جس کے ذیل میں ایک خاص تمدّنی
معاشرہ کی تشکیل ہوئی اور مسلم ایک ایسی قوم قرار پائی جو خدا
کے سوا کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتی اس لیے اس کی
سربراہی بھی کسی تاج و اقتدار سے وابستہ نہیں بلکہ اسی نظام
کے مکمل نمونہ ہونے سے وابستہ ہو گئی جو صرف ملکی حکمراں ہی نہ ہو
بلکہ دینی معاملات میں پیشوا اور رہبر کی حیثیت بھی رکھتا ہو۔

(۴)

حسینؑ کے ساتھ اسلام کا روحانی تعلّق

یہ عالمگیر دین جس کا نام اسلام ہے اپنے ابتدائی دور میں
ترقی و اشاعت کی حیثیت سے دو عظیم شخصیتوں کی جانفشانی اور ان تھک
کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک پیغمبر اسلام حضرت محمّد مصطفےٰ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے اُن کے چچازاد بھائی علی بن
ابی طالبؑ انہی کے ثبات قدم اور حیرت ناک استقلال کا
نتیجہ تھا کہ اسلام کی بنیادیں قائم رہیں اور حیرت ناک تیزی
کے ساتھ اُس کی اشاعت ہوئی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کے اتحاد کو مضبوط سے
مضبوط تر بنانا تھا۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے ساتھ حضرت
علی بن ابی طالب علیہ السلام کا عقد ہوا اور اس طرح علیؑ
بھائی ہونے کے علاوہ ایک قسم کی فرزندی بھی رسولؐ سے
حاصل ہو گئی اور یہ دونوں سلسلے کہ جو اشاعت اسلام
متحد تھے اور زیادہ استحکام کے ساتھ ایک نقطہ پر جمع ہو

ان ہی ماں باپ، حضرت فاطمہؑ اور علی بن ابی طالب
دو بچے متولد ہوئے جن کا نام تھا حسنؑ اور حسینؑ اور عین اُس وقت
کہ جب اسلام ایک نوعمر بچہ کی حیثیت سے رسول اسلام
آغوش میں پرورش پارہا تھا ان دونوں بچوں کی ولادت
ہوئی جن کی پرورش بھی رسولؐ کی آغوش میں شروع ہوئی
اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت
قرار پایا۔ ایک طرف ناناؐ کہ جو بانئ اسلام تھے اور دوسری طرف
باپؑ کہ جو مجاہد و محامی اسلام تھے، اُن کے خدمات اور کار
سامنے تھیں، یہ ماحول بھی اس کا کافی سبب ہو سکتا تھا کہ ا
کے ساتھ روحانی تعلق اور دلی ارتباط ان دونوں بچوں
بچپنے ہی سے راسخ ہو جائے اور جتنی عمر بڑھتی جائے، اُلفت
کا جذبہ مستحکم تر ہوتا جائے۔

دینی حقیقت کے علاوہ کہ یہ رہنمائے دین ہونے کے لیے
ہی ہوئے تھے، تاریخ بھی یقینی طور پر بتا رہی ہے کہ ان دو

بزرگوں کی زندگی پابندی شریعت اور محافظت نوامیس دینی کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کا مکمل آئینہ اور قانون خداوندی کا پورا مجسمہ تھی اور اس لئے بھی اسلام اور شریعت اسلام کے ساتھ جتنی گہری ہمدردی ان کو ہو سکتی تھی کسی کو نہیں۔

⑤

بنی اُمیّہ

پیغمبر اسلام ص کے پردادا جناب ہاشم کا ایک بھائی عبدالشمس تھا جس کے لیے مشہور تاریخی روایت ہے کہ اُن کے ساتھ ساتھ جڑواں پیدا ہوا تھا۔

عبدالشمس کا بیٹا اُمیّہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے عبدالشمس کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی، وہ جلدی ہی دنیا سے اُٹھ گیا اور جناب ہاشم کافی عمر تک پہونچے، اس لئے اُمیّہ جو ان کا بھتیجا تھا جناب ہاشم کے جاہ و جلال اور شہرت و ہردلعزیزی کے سامنے اپنے کو ایک حریف کی حیثیت میں لے آیا۔ یہاں تک کہ یہ مسئلہ کہ ہاشم اور اُمیّہ میں کس کو ترجیح ہے باقاعدہ ثالث کے سامنے پیش ہوا اور اُس نے جناب ہاشم کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے اُمیّہ کو کافی عرصہ تک کے لیے ملک حجاز کو خالی کر دینے کا فرمان صادر کیا چنانچہ اُس نے یہ مدت مُلک شام میں گزاری۔

اُمیہ کا بیٹا حرب ہوا۔ اُس نے ہاشم کے بیٹے حضرت
عبدالمطلب سے مقابلہ کیا اور اُسے بھی شکست ہوئی اب
حرب کا بیٹا ابوسفیان تھا اور جناب عبدالمطلب کے پوتے
حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ
علیہ السلام تھے۔ اب خالق کریم نے بنی ہاشم کے چشم وچراغ،
عبدالمطلب کے پوتے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو
پیغمبری کا منصب تفویض کیا اور حضرت علی مرتضیٰؑ جو عبدالمطلب
کے دوسرے پوتے تھے اس مہم میں اُن کے دست و بازو ہوئے
تو ابوسفیان جو اس وقت بنی اُمیہ کا راس ورئیس تھا اسلام
کے مخالف محاذ کا سپہ سالار بن گیا جس کے سلسلہ میں بدر،
اُحد اور خندق کی خوں ریز لڑائیاں ہوئیں جن میں اُسے
ہر دفعہ ناکامی ہوتی رہی اور آخر اُس کی طاقت کے پرخچے
اُڑ گئے اور قوت مقابلہ ختم ہوگئی تو فتح کہ میں اُس نے اسلام
قبول کیا، جسے اسلام نہیں بلکہ صحیح معنی میں استسلام یعنی ہتھیار
ڈالنا ہی سمجھا جا سکتا ہے جس سے دشمن دوست نہیں بن جایا
کرتا بلکہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے سردست اپنی عاجزی
تسلیم کرتے ہوئے موقع کا منتظر ہو جاتا ہے اور اس لیے
مسلمانوں کو ہمیشہ ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی کہ انھیں
کوئی ایسا اقتدار حاصل نہ ہو سکے جس سے انھیں اسلام سے

اپنی دیرینہ دشمنی کے ماتحت کسی تباہ کن منصوبہ کی تکمیل کا موقع
حاصل کر سکے۔

(۶)

اسلامی تعلیم کے امتیازی اقدار

اصل اصول جس کی تبلیغ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے اپنا نصب العین قرار دیا توحید تھی اور ہر قسم کے شرک کی
نفی ـــ مگر یہ فقط فلسفی قسم کا ایک نظریہ نہ تھا جس کا عمل کی
دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو ـــ نہ اسلام کا کلمۂ توحید جس کی
رسولؐ تلقین فرماتے تھے کوئی زبانی ورد یا وظیفہ تھا جو مشائخ
صوفیہ کی طرح حضرت رسول خداؐ مسلمانوں کو سکھا رہے تھے
بلکہ وہ ایک ذہنی انقلاب کا پیغام تھا جس کے تحت میں انفرادی
اور اجتماعی کردار کی تشکیل ہوتی ہے ـــ

افراد ہی کے کردار سے سماج کی تشکیل ہوتی ہے اور افراد
ہی وہ مختلف نقطے ہوتے ہیں جن سے مل کر چھوٹے اور بڑے
اجتماعی دائروں کی تشکیل ہوتی ہے یعنی اچھے آدمیوں سے
اچھا گھر اور اچھے گھروں سے اچھا گھرانا اور اچھے گھرانوں سے
ہی اچھا محلہ، اچھا شہر اور اچھا ملک سب بن سکتا ہے۔ اور اگر

افراد خراب ہوں تو ان میں سے کوئی چیز بھی اچھی نہیں بن سکتی
____ اس طرح پیغمبر اسلام کا پیغام توحید جو بظاہر ہر ہر فرد کے ذاتی عقیدہ سے متعلق تھا نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے لیے عظیم اخلاقی معاشرتی اور معاشی اور اس کے ضمن میں سیاسی انقلاب کا پیغام تھا۔

اسلام سے پہلے عرب کی معاشی اور معاشرتی دنیا جس قدر تاریک تھی اُس کا ہر شخص تاریخ میں مشاہدہ کر سکتا ہے۔ مساواتِ انسانی کوئی چیز نہ تھی اور غلبہ، طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ تھی کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اُس کے قاتل کو نہ قتل کیا جاتا تھا بلکہ فریق مخالف کے سیکڑوں آدمی مار ڈالے جاتے تھے، تب سمجھا جاتا تھا کہ اُس کے خون کا بدلا ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اُس کا خون معاف تھا۔

یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اُڑا رہی تھی، ان سب کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا اس لیے مادی طاقت ہی اُن کے نزدیک سب کچھ تھی۔

جب "اسلام" نے اس کا اصلی سبب دُور کرتے ہوئے لوگوں کی

نگاہ کو مادّیت کے احاطہ سے آگے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے تو تمام تفوق اور بلندی کے اقدار مٹ کر نیا امتیاز قائم ہو گیا کہ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ)

اس اُصول کے ماتحت غلبہ طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت۔ یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں۔ اُس نے کہا کہ ہر انسان دوسرے کے برابر ہے جب تک کہ انسانیت کے اوصاف میں اپنے کو اُس سے بہتر نہ ثابت کرے۔

اس سے معاشی، معاشرتی اور تمدنی حالات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئیں، بہت سے بلند خاندان کے افراد کی شادی کی گئی اُن خاندانوں میں جو قدیم زمانہ سے پست سمجھے جاتے تھے اور ایک بلند مرتبہ شخص کے قاتل کے بدلے یہ امر ناممکن ہو گیا کہ سوا اُس کے کوئی دوسرا شخص قتل کیا جائے۔

بہت سے غیر قوم اور پردیسی انسانوں کو جو اس کے پہلے جانوروں کے برابر سمجھے جاتے تھے اُن کے انسانی اوصاف کی بدولت وہ عزّت حاصل ہو گئی جو بڑے بڑے خاندانی عربوں کو نہ تھی اور اکثر مہموں میں عرب قوم کو سرداری قبول کرنا پڑی اُن لوگوں کی جنھیں وہ نسلی حیثیت سے اپنے برابر نہ سمجھتے تھے یا

مادّی غلبہ اور اقتدار کے لحاظ سے جنھیں وہ کمزور خیال کرتے تھے۔

(۷)

حکومتِ الٰہیہ یا خلافتِ رسولؐ

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی دنیوی سلطنت تو قائم کی نہیں تھی۔ نہ آپ نے طرزِ عمل شاہانہ رکھا اور نہ اپنے کو "بادشاہ" کہلانا کبھی پسند فرمایا۔

آپ کے دینی آئین میں دین سے دنیا کوئی الگ چیز بھی نہ تھی کہ دینی پیشوا کے علاوہ کسی دنیوی حاکم کا تصور پیدا ہوتا۔

اسلام میں دنیا دین کی تابع ہے لہٰذا جو دینی پیشوا ہے اُسی کو ضمناً دنیوی نظام کی سربراہی بھی حاصل ہوگی۔ اب جس کو خالق کی طرف سے دینی قیادت کا منصب حاصل ہے، وہی جماعت اسلامی کی تنظیم کا مرکز اور فرماں روائے مطلق ہے۔

اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں آکر کوئی کانفرنس کر کے اپنی حکومت تسلیم نہیں کرائی بلکہ آپ کی رسالت پر ایمان لانے کا عملی تقاضا یہی تھا کہ تمام ایمان لانے والے آپ کی حکمرانی کو تسلیم کریں جس کا قرآن مجید میں متعدد جگہ اعلان موجود ہے۔

جب کہ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت مطلقہ

دین الٰہی کے مکمل نمائندہ ہونے کی حیثیت سے تھی تو آپ کی
جانشینی بھی کسی ایسی ہی فرد کو حاصل ہو سکتی تھی جو خدا ورسولؐ
کے معیار پر ان اقدار کا ایسا کامل نمونہ ہو کہ اُس کے ہاتھوں
نظام شریعت میں کسی تبدیلی یا خلق خدا کی کسی صورت سے بھی
گمراہی کا اندیشہ نہ ہو اور جب کہ پیغمبرؐ کے انتخاب میں رائے
عامہ یا انتخاب قوم کا کوئی دخل نہیں ہے تو آپ کے جانشین
کا انتخاب بھی انسانوں کی صوابدید سے نہیں ہو سکتا بلکہ خدا و
رسولؐ ہی ایسے افراد کو معیّن کر سکتے ہیں۔ جو اس منصب
کے حامل ہوں، چنانچہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متفق علیہ
احادیث میں اُس پورے سلسلہ کی نشان دہی کر دی گئی تھی
جن کی رہنمائی اور امامت کو اعتقاداً اور عملاً تسلیم کرنا اُمت کے
گمراہی سے محفوظ رہنے کی ضمانت تھی۔ اس سلسلہ کے افراد
کی سرداری اور امامت حقیقۃً اُن کے اوصاف کمال اور اسلامی
اقدار کی علمی و عملی صحیح ترجمانی کی بناء پر تھی مگر چونکہ وہ پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اس لیے
تعارف اُن کا قرآن اور متفق علیہ احادیث میں ذوی القربیٰ۔
الآل۔ العترۃ یا اھل البیت کے ناموں سے کر دیا گیا۔

لیکن پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ہوتے ہی
مسلمانوں میں سیاسی ہوا ایسی چلی کہ اُنھوں نے رسولؐ کے جانشین کا

ایک مُلکی سربراہ کی حیثیت سے تصور کر کے اُس کے انتخاب کو
اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح عام نظروں میں علمی اور اخلاقی
رفعتوں کے اقرار کے باوجود اہل بیتِ رسولؐ کو مسلمان اکثریت
کی فضا میں وہ سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہوسکی کہ شریعت کے
مکمل تحفظ کا وہ مقصد جو خدا اور رسولؐ کے مدِّنظر تھا پورا ہوسکتا
اور اس لیے محافظین شریعت کے مسلسل اظہارِ حق کے باوجود
اقتدار حکومت کے وزن نے تمدن اسلامی اور شریعت الٰہی کے
اقدار کو متاثر کرنا شروع کر دیا ـــ جو ممکن ہے عرصہ تک
غیر شعوری طور پر ہوتا رہتا اور اس لیے اُس کی رفتار سُست
رہتی بشرطیکہ وہ جماعت برسرِ اقتدار نہ آجاتی جس کے زیادہ تر
افراد نے بے چارگی کے عالم میں اسلام کی نقاب اپنے چہروں
پر اسی لیے ڈالی تھی کہ کبھی اس پردے میں اپنے دیرینہ
منصوبوں کی تکمیل کا موقع مل سکے اور اس انقلاب کی بڑھتی
ہوئی رَو کو روکا جاسکے جو اسلام کے زیر اثر تیزی کے ساتھ
آگے بڑھ رہا ہے۔

(۸)

بنی اُمیہ کا دورِ حکومت

یا

تاریخ کا ایک سیاہ ورق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک اسلام کی سادگی، حقیقت پروری، ظاہری جاہ وعزت سے بے تعلقی اور مادی ساز وسامان سے کنارہ کشی ایک حد تک محفوظ رہی لیکن ایک طرف تو فتوحات اور قیصر وکسریٰ کے ممالک پر مسلمانوں کے قبضہ کے ساتھ مادی تزک واحتشام اور سلطنتی جاہ و جلال سے ان کی آنکھیں دوچار ہوئیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی قدیم حریف جماعت بنی اُمیہ کو حصول اقتدار کے مواقع مل گئے یہ اقتدار خلیفۂ ثانی (عمر بن الخطاب) کے دور میں بحیثیت ایک صوبہ دار حاکم کے شروع ہوا جب یزید بن ابی سفیان اور پھر ان کے دوسرے بھائی معاویہ کو شام کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت کے آغاز ہی سے اپنی روش ملوکانہ شان و شوکت کی حامل رکھی۔

خلیفۂ وقت کی طرف سے اس پر انتباہ ہوا تو ایک چالاک اور

شاطر سیاست دان کی طرح یہ کہہ کر سمجھا دیا گیا کہ چونکہ شام کی سرحد قیصر روم کے ملک سے ملی ہوئی ہے اس لیے یہاں اسلام کی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے اس طرح کے جاہ و جبروت کی ضرورت ہے۔

سمجھنے والے سمجھے کہ اس طرح دراصل حقیقت اسلام کے اُن اقدار کو مٹانا ہے جو اُس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ و شوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیے تھے ـــــــ

سیاسی حالات کے بہاؤ میں خلیفۂ ثانی کے بعد مرکزی حکومت کی مسند بھی بنی اُمیّہ کے زیر قدم آگئی ـــــــ

خلیفۂ ثالث سے عقیدت رکھنے والے شخصی حیثیت سے اُن کو اپنی نیّت کے اعتبار سے اُن منصوبوں سے الگ مان سکتے ہیں جو دوسرے افراد بنی اُمیہ کے پیش نظر تھے، لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے پورے طور پر اس دور خلافت سے بنی اُمیہ نے فائدہ اُٹھایا اور وہ امتیازات و اقدار بہت شدت کے ساتھ بدلنے لگے جو اسلام نے قائم کیے تھے ـــــــ

چنانچہ اس دور میں بلند مرتبہ صحابۂ رسولؐ اور سچے اسلامی فرزندوں کے ساتھ سخت تشدّد سے کام لیا گیا جیسے کہ ابوذر غفاریؓ جلا وطن کیے گئے اور عمار یاسرؓ اور ابن مسعودؓ ایسی ہستیوں

کو زد و کوب کیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسلام کے قائم کردہ اقدار کے لحاظ سے بڑی عظمت کے حامل تھے مگر موجودہ طاقت و اقتدار کی نگاہ میں وہ بالکل کم وقعت اور بے حقیقت ہو گئے تھے ــــــ اس کے برخلاف اپنے عزیزان خاص کے ساتھ خصوصی امتیازات برتے جا رہے تھے اور اُن کے بدترین مظالم کی بھی حمایت کی جاتی تھی ــــــ یہ عزیز کون تھے؟ وہی بنی اُمیہ جو اسلامی معیار عظمت کے لحاظ سے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے مگر اس وقت اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی یہاں تک کہ اس سے جمہور اُمت میں بے چینی پیدا ہوئی جس کا پانی سر سے اونچا اتنا ہو گیا جس کے نتائج قتل خلیفہ تک پہونچ گئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس قتل کی ذمہ داری بہت کچھ بنی اُمیہ کے سر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور تمام جماعت صحابہ نے بھی جو اہل حل و عقد سمجھی جاتی تھی، حضرت علیؑ کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور سب نے باتفاق آپ کی بیعت کی لیکن شام کے گورنر معاویہ نے جو اُسی پُرانے تاریخی ابو سفیان کے فرزند تھے اور وہ شام میں پورے طور پر اپنا اقتدار مضبوط کر چکے تھے، اس متفقہ فیصلہ کے سامنے سر نہ جھکایا بلکہ وہ انتقام خون عثمان کے بہانے سے حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے برسرپیکار ہوئے جس کے نتیجہ میں جنگ صفین

کے معرکوں میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا
آخر اس جنگ کا خاتمہ ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص کے
سازشی فیصلہ پر ہوا جس میں اگر دیانت و امانت کا جوہر کار فرما
ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کے درمیان سے ناگوار اختلاف کا خاتمہ
ہو سکتا تھا لیکن افسوس کہ حرص و آز کے بڑھتے ہوئے
سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ و فساد کا پیش خیمہ
قرار دے دیا اور اختلاف و افتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ
وسیع ہو گئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی اُمیّہ کے قدم پوری
طاقت کے ساتھ جم گئے تھے۔ اُدھر امیر المومنین علیؑ کو مسجد کوفہ
میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفت اہلبیتؑ کا طوفان پوری
قوّت پر بلند ہو گیا اور دمشق بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ کے منبروں پر
کمال جرأت کے ساتھ اہل بیت رسولؐ پر لعن و طعن کا بازار
گرم ہو گیا۔

اُس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات

معاویہ اگرچہ صحابۂ رسولؐ کی ایک
فرد سمجھے جاتے ہیں لیکن اُن کے
دَورِ حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو اسلامی تاریخ
میں جلی حرفوں سے مرقوم نظر آتے ہیں اور اُن سے اس زمانہ
میں اِسلام کے ضعف و کس مپرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) وضع احادیث اور خدا اور رسولؐ پر افتراء و بہتان کوئی جرم نہ رہا بلکہ اس پر مخصوص مصالح کے تحت میں جائزہ و انعام دیا جاتا تھا چنانچہ ابوالحسن علی بن محمد مدائنی نے جو اسلامی مورخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے کتاب الاحداث میں اس زمانہ کے حالات درج کرتے ہوئے لکھا ہے:-

کتب معاویۃ الی عمالہ فی جمیع الآفاق ان لا یجیزوا لاحد من شیعۃ علیؑ شہادۃ وکتب الیہم ان انظروا من قبلکم من شیعۃ عثمان ومحبیہ واھل ولایتہ الذین یروون فضائلہ ومناقبہ فادنوا مجالسہم وقربوھم و اکرموھم واکتبوا لنا کل ما یروی کل رجل منہم واسمہ واسم ابیہ وعشیرتہ ففعلوا ذلک حتی اکثروا فی فضائل عثمان ومناقبہ لما کان یبعث الیہم معاویۃ من الصلات والکساء والحباء والقطائع و یفیضہ فی العرب منہم و الموالی فکثر ذلک فی کل مصر وتنافسوا فی المنازل والدنیا فلیس یجد امرء من الناس عاملا من عمال معاویۃ فیروی فی عثمان فضیلۃ او منقبۃ الا کتب اسمہ وقربہ و شفعہ فلبثوا بذلک حینا۔

"معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اُس کا پورا نام مع پتہ کے میرے پاس

لکھ کر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے اُس کو مالامال کر دو
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں احادیث کثرت سے ہو گئیں
اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔"

ثم کتب الی عماله ان الحدیث فی عثمان قد کثر و نشا
فی کل مصر و کل وجه و ناحیة فاذا جاء کم کتابی هذا فادعوا
الناس الی الروایة فی فضائل الصحابة و الخلفاء
الاولین و لا تترکوا خبرا یرویه احد من المسلمین فی ابی
تراب الا و ائتونی بمناقض له فی الصحابة فان هذا احب
الیّ و اقر لعینی و ادحض لحجة ابی تراب و شیعته و اشد
علیهم من مناقب عثمان و فضله فقرأت کتبه علی الناس فرویت
احادیث کثیرة فی مناقب الصحابة مفتعلة لا حقیقة لها
وجد الناس فی روایة ما یجری هذا المجری حتی اشادوا
بذکر ذالك علی المنابر و القی الی معلمی الکتاب فعلموا
صبیانهم من ذالك الکثیر الواسع حتی رووه و تعلموه کما
یتعلمون القرآن و حتی علموه بناتهم و نساءهم و خدمهم
و حشمهم فلبثوا بذلك ما شاء الله۔

"پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث
کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے فضائل میں
روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت

بھی ابوتراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوی ہے اس کے مقابل دوسرے صحابہ کے لیے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔ بس پھر کیا تھا فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابۂ کبار کے مناقب میں تصنیف ہوگئیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی۔ واعظین اُن کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچّوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں، عورتوں اور غلاموں کنیزوں تک کو یاد کرانا ضروری سمجھتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط ہو کر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب وشتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا، دمشق و شام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ رسم جاری رہی اور علی بن ابی طالبؑ کی نسبت اس جسارت کا سلسلہ قائم رہا۔

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری (صحابی رسولؐ) نے شراب کے بار سے لدے ہوے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے

نیزہ کی نوک سے اُن مشکوں کو پھاڑ ڈالا۔ معاویہ کو خبر معلوم ہوئی
تو کہا اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے، عبدالرحمٰن
نے سنا تو کہا خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالتمآب نے
ممانعت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل
ہو یا برتنوں میں رکھی جائے (دیکھو کتاب اسدالغابہ، ابن اثیر
جزری جلد ۳ صفحہ ۲۹۹ و اصابہ حافظ ابن حجر عسقلانی جلد ۲ ص ۴۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد
مسلمانوں میں بہت شدت سے ہوگئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان
تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بے گناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے لگا
سیکڑوں کلمہ گویوں کی گردنیں زیر تیغ ہوگئیں، سمرۃ بن جندب
اور بسر بن ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کی
نامۂ عمل ہیں۔ عبیداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں
ذبح کر دیئے گئے جس سے وہ مجنون ہوگئیں (ملاحظہ ہو
استیعاب ابن عبدالبر مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول ص ۶۶)

(۵) مذہب کا وقار بالکل کم ہو رہا تھا اور بڑے سے بڑے
ارکان مذہبی کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔

حضرت علیؑ کی خلافت کا مختصر دور تمامتر اسی اموی اقتدار
کے مقابلہ میں صرف ہوا۔ جس میں حضرت علیؑ کو بہت محدود کامیابی

حاصل ہو سکی۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے ساتھ اُس اقتدار میں اور اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ حضرت امام حسنؑ کو صلح پر مجبور ہونا پڑا اور اس طرح آپ نے مخالف طاقت کے جارحانہ اعمال کو شرائط صلح کے ذریعہ سے محدود بنانے کی کوشش کی مگر حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور شرائط صلح کی خلاف ورزی کی جانے لگی۔ اور سیاسی اقتدار کی جرأت دیا کی اس حد پر پہونچی کہ حجر بن عدی اور اُن کے بہت سے ساتھیوں کو جو بڑے عابد و زاہد متقی اور پارسا تھے تہ تیغ کر دیا گیا اور عمرو بن الحمق الخزاعی کا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بڑا درجہ رکھتے تھے سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کا نظریۂ روحانیت و للّٰہیت فنا ہونے لگا اور مسلمانوں میں بھی "طاقت حق ہے" کا عملی طور پر کلمہ پڑھا جانے لگا۔ حق پرستی ختم ہوی آزادی ضمیر رخصت ہوی ایمان اور اعتقاد ردّ پہلے اور سنہرے سکّوں پر بیچا جانے لگا اور مادّی اقتدار کے طاغوت کی پرستش ہونے لگی۔

یہ حالات پھر بھی برداشت کیے جانے کے قابل تھے اگر معاویہ کی جانب سے اس شرط کی مخالفت نہ ہوتی کہ ان کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام حسنؑ نے بڑی عاقبت اندیشی اور انجام بینی سے یہ شرط

قرار دی تھی مگر اموی سیاست اپنے مقاصد کے لحاظ سے نا
اور ناکام رہتی اگر اس شرط پر عمل کر لیا جاتا۔ اس لیے معاو
نے اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد بنایا اور صر
نامزد ہی نہیں بنایا بلکہ تمام عالم اسلامی سے بڑی کوشش
ساتھ یزید کی بیعت حاصل کی گئی۔

یزید کے افعال و اعمال اگر وہ نہ بھی ہوتے جن کو اس
بعد مختصر طور سے بیان کیا جائے گا تب بھی اُس کو ولی عہد بنا
شرائط صلح نامہ کے خلاف ہونے کی بنا پر ناجائز تھا مگر مسلما
میں اقتدار و طاقت سے مرعوبیت اس درجہ بڑھ گئی کہ کسی
اس پر توجہ نہ ہوئی اور توجہ ہوتی بھی تو اظہار کی جرأت نہ تھی

آلِ رسولؐ میں اس وقت بزرگ ہستی حضرت امام حسینؑ
تھی۔ آپ بنی اُمیّہ کے طرز عمل کو مدت سے محسوس کر رہے
کہ وہ کس طرح اسلام کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے اور
کس طرح دنیا کو رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی طرف
لے جا رہا ہے پھر بھی وہ اس کے متوقع تھے کہ شاید یہ صورت حا
معاویہ کی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم ہو جائے مگر یہ اس
انقلابی سیاست کی آخری چال تھی کہ شاہان خود مختار کی طر
اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے کو بغیر اس کے اوصاف کا لحا
کیے ہوئے نامزد کیا...

اور اندازہ کیا کہ آپ پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔

معاویہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ متعلق الانسان حسینؑ ہیں، اس لیے اُنھوں نے آپ کو ملانے کی پوری کوشش کی مگر نتیجہ میں ناکام ہونا پڑا۔ یہ بنی اُمیّہ کے اقتدار کو بڑی کاری ضرب تھی جسے معاویہ کی قوت فراست سمجھ چکی تھی۔ اسے حسین بن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کو سکوت اور بے تعلقی تک محدود رکھا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف اس سکوت کو توڑنے میں انتہائی تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت و شورش کا الزام عائد کیا جا سکے۔

حسن مجتبیٰؑ کی صلح مجاہدۂ کربلا کی تمہید تھی

ہر اقدام جو اپنے وقت پہ ہو وہ مفید نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجۃً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر ہمیشہ کے لیے موردِ الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور اُن کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے۔ عالم کا نظام اسی پر قرار پایا ہے اور انسان کی افتادِ طبع یوں ہی واقع ہوئی ہے، اس میں تغیر و تبدل کا امکان نہیں۔

زخم رسیدہ پکے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو،
پھاہے لگاؤ مرہم بدلو ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ پھر اگر نہ
اچھا ہو اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو
اُسے کاٹ کر بھی پھینک دو، کسی کو اعتراض کا حق نہ ہو گا لیکن
اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی یا کوئی علاج معالجہ کرنے کے
پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام اور عام طور پر بے عقل
سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرز عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کیے جانے
پر ممدوح و مستحسن سمجھا جا رہا تھا۔ دشوار گذار حالات کی اصلاح
کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور موثر ترین حربہ
ہے لیکن سب سے آخری۔ جب تمام وسائل و ذرائع ختم ہو جائیں
اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اُس وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں
تک آخری رہے وہیں تک ممدوح ہے اور اگر اس سے پہلے عمل
میں آگئی تو اُس پر جلد بازی غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی
وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو بحق بجانب
نہیں سمجھا جا سکتا اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی اور تاثیر رخصت

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج و استغاثہ مصالحت رواداری
شرط و شروط اور قرار داد و معاہدہ، یہی چیزیں ہیں جن کا اختیار
کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔

بے شک جب یہ سب وسائل و ذرائع اختیار کیے جانے کے بعد

ناکام ثابت ہوں تو پھر من جرب المجرب حلت بہ الندامتہ "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہوسکے گا اور اس کی رفتار عمل کو آگے بڑھ کر کسی دوسرے اقدام تک پہونچنے کا حق پیدا ہوگا۔ یہی تدریجی رفتار اقدام عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مغلوب الغضب کہا جائیگا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع واسباب کے ذریعہ سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری وجاں نثاری اور موثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال واعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرماں بردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبر کا پابند ہے تو اسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔

شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بیشک مذہب خطرہ میں تھا اور حق و صداقت پامال ہو رہے تھے جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پُرامن اور صلح پرور وسائل و ذرائع کے صرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔

بیشک اگر امام حسینؑ ایکا ایکا بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اعوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امامؑ نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم اُمور سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسولؐ میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آ کر اپنے کو معرض خطرہ میں کس لیے ڈالا؟ یہ سوالات پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقیناً آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ موثر و کامیاب لیکن واقعہ یہ تھا کہ امام حسینؑ کا اقدام عمل یا قربانی وہ ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہوا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ سنہ ۶۱ھ میں اس کا وقت آگیا۔

شروع شروع امام حسنؑ کا صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ

کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا روبہ اصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کا ٹھکرا دیا جانا صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہو جانا، زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کُش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گذر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لیے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کرا دیا تھا کہ جو انھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

اس اقدام کا نام ہے "مجاہدہ کربلا" جس کے حالات اس کتاب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

پہلا باب

یزید کی خلافت

جزیرہ نمائے عرب کی فضا میں وقتی سکون تھا، جمل و صفین و نہروان کی خونریز لڑائیوں کو جو شورش انگیز افراد کے ذاتی اغراض کا نتیجہ تھیں عرصہ ہو چکا تھا اور تخت و تاج کے اصلی

حقدار (بنی ہاشم) صرف خونریزی کے انسداد اور عامۂ مسلمین کے امن وامان کی خاطر دنیا کی اس ظاہری سلطنت سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشین ہو چکے تھے۔

شام کی اموی سلطنت کا پھریرا حجاز، عراق، یمن سب ہی جگہ لہرا رہا تھا اور قہر و غلبہ سے قائم شدہ حکومت پوری کام سے اپنے مقاصد کو انجام دے رہی تھی۔

خلافت روحانی کے واحد تاجدار اور پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی ورثہ دار (حسینؑ بن علیؑ) مدینہ میں خاموشی کی زندگی گذار رہے تھے اور حکومتِ وقت کی من مانی کارروائیوں سے کوئی تصادم نہ تھا۔

امیر شام معاویہ کے لیے اُن کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں وہ مسلمانوں کی قسمت سے کافی بلند حوصلگی کے ساتھ کھُل کھیل چکے تھے اور دُنیا کی جاہ و حشمت، مال و دولت سے بھی پورے طور پر لذت اندوزی فرما چکے تھے جس کا تذکرہ انتہائی مسرت کے ساتھ انھوں نے خود بھی کیا اور فرمایا:۔

رحم اللہ ابا بکر لم یرد الدنیا ولم ترد الدنیا واما عمر فارادته الدنیا ولم یردھا واما عثمان فاصاب من الدنیا واصابت منه واما نحن فتمرغنا فیھا۔

"خدا کی رحمت ہو حضرت ابوبکر پر، اُنھوں نے نہ دُنیا کو

چاہا اور نہ دُنیا نے اُن کی طرف رُخ کیا۔ اور حضرت عمرؓ اُن کی طرف دنیا آئی مگر وہ دُنیا کے طالب نہ ہوئے اور حضرت عثمانؓ ان اُنھوں نے دنیا میں حصہ لیا اور دنیا نے اُن سے حصہ حاصل کیا لیکن ہم ؟ ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور پھیل پھیل کے اُس میں خوب رہے۔ (طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۶)

لیکن اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے بعد کے لیے بھی مسلمانوں کے قسمت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنی زندگی ہی میں اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کر کے تمام مسلمانوں سے بیعت بھی حاصل کی جس کے لیے روپیہ اشرفی کی تھیلیاں اور حیلہ و سیاست کی تمام صنعت آفرینیاں جائز و ناجائز حدود کی تفریق کے بغیر انتہائی فراخ حوصلگی سے صرف کر دی گئیں۔

یزید کے اخلاقی حالات اور افعال و عادات ایسے نہ تھے جن پر کسی قسم کا پردہ ہو۔ اس لیے امیر معاویہ کو خود اپنے اس اقدام میں عام مسلمانوں کی نفرت و بیزاری کے خوف کا احساس تھا اور اُن کے وہ مخصوص ہوا خواہ اور ارکان دولت جو یزید کی سلطنت کے قائم کرنے میں اُن کے دست و بازو اور روحِ رواں تھے۔ وہ بھی ان واقعات سے بے خبر نہ تھے چنانچہ سب سے پہلے ہی جب اُنھوں نے اپنے طبعزاد و سیاست تراش

بھائی زیاد کو اس بارے میں مشورہ کے طور پر خط لکھا ہے تو زیاد کو خود بڑی تشویش پیدا ہوئی تھی یہاں تک کہ اپنے خاص محرم راز عبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا تھا کہ

ان امیر المومنین کتب الیّ یزعم انہ قد عزم علی بیعۃ یزید وھو یتخوف نفرۃ الناس ویرجو مطابقتھم و یستشیرنی وعلاقۃ امر الاسلام وضمانہ عظیم ویزید صاحب رسلۃ وتھاون مع ماقد اولع بہ من الصید فالق امیر المؤمنین مودیا عنّی فاخبرہ عن فعلات یزید فقل لہ رویدک بالامر فاقمن ان یتم لک ما ترید ولا تعجل فان درکا فی تاخیر خیر من تعجیل عاقبتہ الفوت۔

"حضور خلیفۂ مسلمین نے مجھے خط لکھا ہے کہ اُنھوں نے یزید کی بیعت لینے کا مصمم ارادہ کیا ہے لیکن انھیں لوگوں کی نفرت و بیزاری کا خوف ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح عام مسلمان متفق کئے جا سکیں اور اس بارے میں مجھ سے مشورہ لیا ہے۔ اسلامی ذمہ داری کا احساس بہت اہم ہے اور یزید ایک آزاد منش اور بے پرواہ شخص ہے اور شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم اتنا کرو کہ میری طرف سے حضور خلیفۂ مسلمین میں حاضر ہو کر یزید کے افعال و عادات کا تذکرہ کرو اور کہو کہ ذرا سوچ سمجھ کر اس کام کو کیجیے۔ تھوڑے دن کی تاخیر کر لینا اس سے

بہتر ہے کہ جلدبازی سے کام لیجئے جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔ (طبری ج ۶ ص ۱۶۹)

صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ مفاد اسلامی کے واحد ذمہ دار خلیفۂ مسلمین کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا لحاظ اتنا بھی نہ تھا کہ وہ اُس پہلو کا رسمی حیثیت سے ہی، مشورہ کے وقت تذکرہ کرتے بلکہ اُن کے سامنے جو نمایاں پہلو تھا وہ یہی کہ کہیں اس انتخاب سے عام مسلمانوں کی بے خبری و غفلت کا طلسم ٹوٹ نہ جائے اور اُن میں نفرت و بیزاری کی لہر نہ پیدا ہو۔

اسی کے لیے زیاد بن ابیہ اور مغیرہ بن شعبہ ایسے فتنۂ روزگار مدبرین و ارباب سیاست کے مشورہ کی ضرورت اور ان کی دماغی ہنر آفرینیوں کے مظاہرہ کی حاجت تھی۔

اور آخر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور یزید کی خلافت کھینچی ہوئی تلواروں کے سایہ اور زرد پہلے سنہرے سکوں کی نمائش میں عام مسلمانوں سے تسلیم کرائی گئی۔

فرزند رسولؐ امام حسین علیہ السلام پہلے ہی اُن پانچ آدمیوں میں سے تھے جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی تھی لیکن جہاندیدہ و آزمودہ، تجربہ کار معاویہ سمجھتے تھے کہ بیعت کے معاملہ میں سختی کرنا بنے بنائے کھیل کو بگاڑ دے گا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حسین بن علیؑ بیعت کریں یا نہیں، لیکن خود اپنی طرف سے شورش آفرینی اور نظام

کو درہم برہم کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ بلکہ اسلامی دنیا کے
امن واماں کی خاطر وہ اُس وقت تک خاموش ہی رہیں گے جب
تک اُن کو کھلی ہوئی مخالفت پر مجبور نہ کیا جائے۔
اس لیے اُنھوں نے بیعت یزید کے متعلق آپ کی رائے
معلوم ہوجانے کے بعد آپ کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا
اور واقعات کو مستقبل کے حوالہ کیا۔

دوسرا باب

طلبِ بیعت

مسلمانوں کے جہاندار خلیفہ معاویہ بن ابی سفیان کا ستر اور
اسّی کی درمیانی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ یزید جس کی خاطر اُنھوں
دنیا کی برائی مول لی اور ہر طرح کی نفسانی کاہش وکاوش اختیار
کی یہاں تک مسلمانوں پر اُس کی گرفت مضبوط کی جس کو
خود اپنے اسی مرض موت کے شروع میں یزید کو بُلا کر حسب ذیل
الفاظ میں اُنھوں نے ظاہر بھی کیا تھا کہ
یا بنیّ انی قد کفیتک الرحلة والترحال ووطأت لک
الاشیاء وذللت لک الاعداء واخضعت لک اعناق العرب

وجمعت لک من جمع واحد۔

بیٹا میں نے کوچ اور قیام کی زحمتوں سے بچا دیا اور تیرے لیے تمام سامان مہیّا کر دیے ہیں اور تیرے لیے دشمنوں کے سر خم کر دیئے ہیں اور تمام قوم عرب کی گردنوں کو تیرے لیے جھکوا دیا اور سب کو تیرے اوپر مجتمع کر دیا ہے۔

(طبری ج ۶ ص۱۷۹)

اور وہ یزید جس کی محبت میں اُنھوں نے دنیا سے آگے آخرت کا بھی سوال اُٹھا دیا اور خود اس کے اوپر ایک وقت میں روئے اور فرمایا:۔

ای شیٔ کنت عنہ عزو بًا کبوت سنّی ورّق عظمی وکثرت اللہ موع فی عینی ور میت فی احسن ما یبد ومنی ولولاھوای فی یزید البصرت قصد ی۔

"دنیا میں کونسی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہو گیا۔ ہڈیاں گھُل گئیں اور خطّ و خال نقشہ و صورت میں تغیر ہو گیا، اگر مجھ پر یزید کی محبتّ غالب نہ ہوتی تو میں صحیح راستہ ضرور حاصل کر لیتا۔"

جس پر علامہ ابن حجر کو صاف لکھنا پڑا ہے۔

قولہ لولاھوای الخ فیہ غا التسجیل علی نفسہ بان مزید محبتہ لیزید اعمت علیہ طریق الھدی واوقعتہ الناس

بعدہ مع ذلک الفاسق المارق فی الردی۔

"ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کرلیا ہے کہ یزید کی محبت نے اُن کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو اُن کے بعد ایک ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جو اُن کی ہلاکت کا باعث ہوا۔" (تطہیر الجنان و اللسان بر حاشیہ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صہ ۵۸)

وہ یزید آج اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا اور دمشق کے باہر مقام "حوارین" پر رنگ رلیوں میں مصروف تھا، وہاں اُسے واقعہ کی اطلاع دی گئی اور وہ دمشق پہونچا ایسے وقت جب معاویہ دفن بھی ہو چکے تھے۔

خلافت پہلے ہی سے تسلیم شدہ تھی اور مسلمانوں کا تخت خلافت اب مست شراب، رنگین مزاج، شکار باز یزید بن معاویہ کے قدم کے نیچے تھا اور فرزندانِ توحید کی گردنیں سامنے خم۔ جوانی کا نشہ اور شراب کی ترنگ، بے زحمت و مشقت کی حاصل شدہ سلطنت اور دنیا کی زیب و زینت، اپنے جیسے باپ کی کوششوں کی کامیابی کا یقین اور تمام ملک عرب کے سر اطاعت خم ہو جانے کا غرور پھر نو کاری و ناعاقبت بینی۔ سیاسیات حکومت سے ناشناسی اور نظم سلطنت سے بیخبری اور اس سب کے ساتھ مرنے والے باپ کی لفظیں جو

انھوں نے اپنے مرض کے شروع میں وصیت کے سلسلہ میں کہی تھیں کہ

انی لا اتخوف ان ینازعك هذا الامر الذی استتب لك الا اربعة نفر من قریش الحسین بن علی وعبد اللہ ابن عمر وعبد اللہ بن الزبیر وعبد الرحمٰن بن ابی بکر۔

" مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمہارے لیے مکمل ہو چکا ہے بس قریش کے چار آدمیوں سے کھٹکا ہے۔ حسین بن علیؑ اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر اور عبد الرحمن بن ابی بکر۔

(طبری ج ۶ ص ۱۷۹)

اس کا نتیجہ تھا کہ یزید کو تخت پر قدم جماتے ہی سب سے پہلے جو خیال دامنگیر ہوا وہ یہی کہ کسی نہ کسی طرح ان چار آدمیوں سے بیعت حاصل کی جائے۔

چنانچہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو جو مدینہ منورہ کا حاکم اور رشتہ میں معاویہ کا بھتیجا اور یزید کا چچازاد بھائی تھا یزید نے یہ خط تحریر کیا۔

من یزید امیر المؤمنین الی الولید بن عتبة اما بعد فان معاویة کان عبدا من عباد اللہ اکرمه اللہ واستخلفه و خوله و مکن له فعاش بقدر ومات باجل فرحمه اللہ فقد عاش محمودا ومات برا تقیا

"مسلمانوں کے بادشاہ یزید کی طرف سے ولید بن عتبہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ معاویہ بندۂ خدا تھے جنھیں اُس نے عزت دی اور خلافت عطا کی اور انعام و اکرام سے نوازا وہ ایک مقدار معین تک زندہ رہے اور مدت مقررہ پر انتقال کر گئے۔ خدا اُن پر رحمت نازل کرے، انھوں نے ہر دلعزیزی سے زندگی گذاری اور تقویٰ و نیکی کے عالم میں دنیا سے انتقال کیا۔"

یہ تو رسمی الفاظ ہیں جو خبر وفات کے طور پر لکھے ہی جایا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ایک پُرزہ کاغذ کا اور تھا جس پر لکھا تھا۔

اما بعد فخذ حسینا و عبد اللہ بن عمر و عبد اللہ بن الزبیر بالبیعۃ اخذا شدیدا لیست فیہ رخصۃ حتیٰ یبایعوا والسلام

"دیکھو حسینؑ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بیعت پر مجبور کرو سختی کے ساتھ اس طرح کہ کوئی مراعات نہ ہو اور نہ مہلت دی جائے یہاں تک کہ وہ بیعت کر لیں والسلام۔"

یہ خط تھا کہ جس میں سخت گیری اور غیر رواداری کا عنصر بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب صورت حال خاموشی کے حدود پر باقی نہیں رہ سکتی۔

یعنی حسین بن علیؑ کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریک ظلم نہ ہوں، اسلام دنیا کے لیے ایسے کی قربانی روا ہی کو تسلیم نہ کرے جو شاید بعد تا ...

کا بدلنے والا، احکام اسلامی کا مٹانے والا اور فسق و فجور کی
نشر و اشاعت کرنے والا ثابت ہو سکتا ہے لیکن ہم کو دوسروں
سے مطلب نہیں۔ دنیا تسلیم کرتی ہے تسلیم کرے۔ دنیا مانتی ہے
مانے، ہم اپنی طرف سے فتنہ و فساد کے بھی باعث نہ ہوں گے،
ہم ملک کے امن وامان کو بھی صدمہ نہ پہونچائیں گے، ہم علیحدہ
رہیں گے۔"

بے شک یہ صورت عمل اب باقی رہنا ناممکن ہے۔ اب تو
بیعت ہے یا قتل یعنی مذہب اسلام کے فنا ہونے پر رضامندی
ہے یا اپنی زندگی کو خیرباد کہنے پر آمادگی۔

یہ وہ امر تھا کہ جس نے صورت حال میں انقلاب پیدا کیا
اور خاموش صبر و سکون کی فضا میں تلاطم۔

تیسرا باب

ولید کی ملاقات

یزید کا خط ولید کو پہونچا، ولید کو اس دوسرے جملے کے
دیکھنے سے تشویش پیدا ہوئی، اس لیے کہ وہ اموی خاندان
کا شخص اور امیر شام معاویہ کا بھتیجا بھی تھا لیکن حسین بن علی کی

شخصیت، اُن کی سلامتی نفس اور پاکیزگی و روحانیت، اُن کی خاندانی وجاہت، اُمورِ مُلکی سے بے تعلقی اور فتنہ و فساد سے علیحدگی کا اثر اپنے دل پر لیے ہوئے تھا۔ اور اس لیے وہ آپ کے خلاف کوئی سختی کا قدم اُٹھانا پسند نہ کرتا تھا۔

دنیائے اسلام کا مشہور تاریخی شخص مروان بن الحکم جس کے مختلف النوع واقعات سے رسالتمآبؐ کے عہد سے لے کر آخری دور تک کے جو اسی مروان کی خلافت تک منتہی ہوا تاریخ اسلامی کے اوراق مملو ہیں۔ وہ اس زمانہ میں مدینہ کے اندر ہی موجود تھا اور اگرچہ ولید کے مدینہ کی حکومت پر آنے کے وقت سے اُس میں اور مروان میں کچھ کشیدگی بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمدورفت ترک کر دی تھی لیکن اس موقع پر ولید کو سوا اس کے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ وہ مروان کو بُلا کر اُس سے صورتِ حال کے متعلق مشورہ کرے۔ مروان تو خاندانِ رسالت کا پُرانا دشمن تھا ہی اور پھر اس وقت کے مشورہ میں ممکن ہے اُس کو ولید سے جو خاص کدورت تھی اُس کا اثر بھی کارفرما ہو کہ اُس نے ولید کو اور زیادہ ناگوار صورت سے دوچار کر دیا یعنی اُس نے یہ مشورہ دیا:-

انی اریٰ ان تبعث الساعۃ الی ھؤلاء النفر فتدعوھم الی البیعۃ والدخول فی الطاعۃ فان فعلوا اقبلت منھم

وکففت عنھم وان الواقد منھم فضربت اعناقھم قبل ان یعلموا بموت معاویۃ فانھم ان علموا بموت معاویۃ وثب کل امرئ منھم فی جانب واظھر الخلاف والمنابذۃ ودعا الی نفسہ۔

"میری رائے تو یہ ہے کہ تم ابھی ان لوگوں کو بُلوا بھیجو اور اُن کو بیعت کرنے اور اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دو۔ اگر وہ ایسا کریں تو اُن سے قبول کرو اور انھیں چھوڑ دو اور اگر انکار کریں تو ابھی اُن کی گردنیں قطع کراؤ اور قتل کرادو۔ قبل اس کے کہ انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہو اس لیے کہ اگر کہیں انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہوگئی تو ہر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائے گا اور مخالفت کا اظہار کریگا اور اپنی طرف لوگوں کو دعوت دے گا"!

ولید کی نگاہ میں معاملہ میں اہمیت اور زیادہ ہوگئی اور فکر واندیشہ کی کشمکش اس حد تک پہونچی کہ اُسی وقت عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا حضرت حسین بن علیؑ اور عبداللہ بن زبیر کے بُلانے کو بھیجا۔

یہ دونوں بزرگوار اُس وقت مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے اور بوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہونچا کہ امیر نے آپ کو بُلایا ہے اور وقت ایسا تھا کہ اُس وقت ولید باہر نہ بیٹھتا تھا

اور لوگوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی۔

ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔

عبداللہ بن زبیر: یہ ولید کے بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت بلانے کا سبب ؟! کچھ آپ کے خیال میں آتا ہے ؟ یہ کیا بات ہے۔

امام حسینؑ: میرا خیال ہے کہ ان کا ظلم کا دیوتا دنیا سے اُٹھ گیا ہے اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کے لیے بلایا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نہ پائے اور ہم پابند کر لیے جائیں۔

عبداللہ بن زبیر: خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ پھر اب ؟

امام حسینؑ: میں تو ابھی اپنے خاندان کے جوان مردوں کو جمع کرتا ہوں اور اُن سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں اُن لوگوں کو دروازہ پر کھڑا کر دوں گا اور میں اندر جاؤں گا۔

عبداللہ بن زبیر: مجھے اس صورت میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے کہیں آپ قتل نہ کر دیے جائیں۔

امام حسینؑ: میں جاؤں گا تو کچھ سمجھ کے جاؤں گا۔ اتنا سامان کر لوں گا کہ مجھے خطرہ باقی نہ رہے۔

حضرت بیت الشرف تشریف لے گئے اور اپنے اعزہ اور مخصوصین کو جمع کر کے اُن کے ساتھ ولید کے دروازہ پر پہونچے۔

ساتھیوں سے فرمایا کہ تم دروازہ پر ٹھہرو اور میں اندر جاتا ہوں۔ اگر میں تمھیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوئی تو تم سب کے سب اندر چلے آنا اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔

حضرت اندر تشریف لے گئے۔ ولید اور مروان آج خلاف معمول پاس پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک خاموشی ہے کہ جو چھائی ہوئی ہے۔

حضرت نے بالکل اس خیال کو مخفی رکھتے ہوئے کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے، سادہ انداز میں فرمایا:

الصلة خير من القطيعة اصلح الله ذات بينكما۔

"اتفاق واتحاد بہ نسبت نزاع واختلاف کے بہتر چیز ہے خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنا دے۔"

اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور حضرت تشریف فرما ہوئے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سنایا غالباً وہی حصہ جس میں معاویہ کی وفات کا تذکرہ تھا۔ اور اس کے بعد بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ حضرت نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون" معاویہ کے لیے خدا کا رحم وکرم شامل حال ہو، اور تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا ہو۔ رہ گیا یہ امر کہ میں بیعت کر لوں تو ظاہر ہے کہ مجھ ایسے شخص کی بیعت مخفی طور سے تو ہو نہیں سکتی، اور نہ غالباً

تم اس کو کافی سمجھو گے جب تک کہ اس کا عام طور سے علانیہ اظہار نہ ہو۔"

ولید: بے شک۔

امامؑ: تو پھر جب تم معاویہ کی وفات کا اعلان کرنا اور تمام لوگوں کو بیعت یزید کی دعوت دینا تو سب کے ساتھ ہم سے بھی یزید کی بیعت کا مطالبہ کرنا تا کہ معاملہ یکساں رہے اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔

ولید جو ایک حد تک صلح جو و صلح پسند واقع ہوا تھا اس تقریر سے خوش ہو گیا اور کہا "بہتر آپ واپس جائیے اور سب کے ساتھ پھر آئیے گا۔"

مروان ابھی تک خاموش بیٹھا صورت حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب جو اپنی حسرت کو پامال ہوتے دیکھا تو بے اختیار ہو کر بول اٹھا۔ "ولید یہ کیا غضب کرتا ہے؟۔ اگر حسین اس وقت تیرے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا جب تک کہ بہت سے لوگ طرفین کے قتل نہ ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ ابھی ان کو گرفتار کر لے اور تیرے گھر سے جانے نہ پائیں یہاں تک کہ بیعت کریں یا قتل کیے جائیں۔"

یہ لفظیں تھیں جنھیں سُن کر امام حسینؑ کو غصہ آ گیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ یا ابن الزرقاء

انت تقتلني ام هو كذبت والله واثمت۔

"کیا تیری بھی یہ مجال ہے یا ولید کی کہ مجھے قتل کرے۔ غلط کہا تو نے خدا کی قسم اور گنہگار ہوا۔"

یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے اصحاب کی معیّت میں گھر واپس تشریف لائے۔

مروان نے ولید سے کہا "تو نے میرا کہا نہ مانا۔ اب ایسا موقع نہ ملے گا۔"

ولید: ویحک غیرک یا مروان انک اخترت لی التی فیھا هلاک دینی والله ما احب ان لی ما طلعت علیه الشمس وغربت عنه من مال الدنیا وملکھا وانی قتلت حسینا سبحان الله اقتل حسینا ان قال لا ابایع والله انی لاظن امرءً یحاسب بدم حسین لخفیف المیزان عند الله یوم القیامة

"مروان یہ کسی اور سے کہو۔ تم نے مجھے وہ صورت بتائی ہے جس میں میرے لیے دینی حیثیت سے موت ہے۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ تمام شرق و غرب کا مال و دولت میرے قبضہ میں ہو اور میں حسینؑ کو قتل کروں۔ سبحان اللہ میں حسینؑ کو قتل کروں صرف اتنی بات پر کہ اُنھوں نے کہا میں بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ جو شخص حسینؑ کے خون کا مجرم ہوگا وہ خدا کے یہاں میزان عمل میں انتہائی سبک

ثابت ہو گا روز قیامت"

مروان نے یہ سنا تو کہا کہ ہاں! اگر تمھارا عقیدہ یہ ہے تو تم نے بلاشک بہت اچھا کیا" یہ کہا تو مگر مروان کو ولید کے طرز عمل سے سخت تکلیف ہوئی اور وہ کسی طرح اس پر رضامند نہ تھا۔

امام حسینؑ کا مقصد آپ کے طرز عمل سے صاف ظاہر ہے۔ اگر آپ کو معاویہ کے بعد یزید کی خلافت ہوتے ہی شورش برپا کرنا ہوتی اور بجبر و قہر اپنی سلطنت کا اعلان کرنا ہوتا تو اسی موقع پر جب آپ ولید کی ملاقات کو گئے تھے اور تیار رہو کر اتنی جمعیت کے ساتھ گئے تھے جو آپ کی سخت سے سخت موقع پر وقتی حیثیت سے حمایت کے لیے کافی تھی تو اُسی وقت ولید و مروان کی اس گفتگو کے سنتے ہی آپ ولید اور مروان پر حملہ کر دیتے اور اُن دونوں کو قتل کر کے اُسی وقت دارالحکومت مدینہ پر قبضہ کرتے اور اس طرح وقتی طور پر یقیناً مدینہ اور اُس کے اطراف کے اندر آپ کی سلطنت و حکومت مسلّم ہو جاتی لیکن یہ آپ کا مقصد نہ تھا۔ آپ تو صرف اپنے کو بیعت سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے اور اصحاب کے مجمع سے بھی جنھیں ساتھ لے گئے تھے صرف مدافعت کا کام لینا منظور تھا۔ اسی لیے باوجود اس سخت کلامی تک نوبت آجانے کے آپ نے اُن لوگوں کو اندر نہیں بلایا اور نہ کسی

عملی اقدام کی اجازت دی۔ اس سے صورت واقعہ اور حضرت کی نیّت پر بہت صاف روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ امن وامان کی حفاظت کا پہلو ہر وقت آپ کے پیش نظر تھا۔

چوتھا باب

مدینہ سے روانگی

امامؑ نے اس کے بعد یہ طے کر لیا کہ اب مدینہ میں میرا قیام مناسب نہیں ہے۔

وہ لوگ جو بے سمجھے بوجھے واقعات پر نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں وہ اس طرز عمل کو تدبّر کے خلاف بتلاتے اور دانشمندانہ نقطۂ نظر سے قابل اعتراض قرار دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے مدینہ میں قیام کیوں نہ کیا، جب کہ وہ آپ کا آبائی وطن تھا، وہاں کے لوگ آپ کی خاندانی وجاہت وخصوصیت سے واقف اور آپ کی شخصیت کے گرویدہ تھے، وہاں کے مہاجرین وانصار جو اس کے قبل رسولؐ کی امداد

حمایت میں جانفشانی کرتے رہے تھے۔ وہ اپنے رسولؐ کے
پیارے نواسے کو کبھی نہ چھوڑتے اور آپ کے پسینہ پر
اپنا خون بہا دیتے، اس لیے حضرت کو اگر اپنی حفاظت
منظور رکھنی تو مدینہ میں قیام کرنا زیادہ بہتر تھا۔"

یہ خیال ہے جو اکثر اشخاص کے دل و دماغ میں گردش کرتا
اور کبھی تراوش قلم سے صفحہ کاغذ پر بھی آجاتا ہے۔ لیکن جب
ہم تاریخی واقعات کی چھان بین کرتے ہیں اور قبل و بعد
کے مشاہدات کو تجربہ کی سلک میں ایک ساتھ منسلک کرتے
ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ کی افتاد طبع نیرنگی و
متلون مزاجی، بے صبری و دگرگونی کے اعتبار سے اس درجہ
قابل افسوس ہے کہ اُن کی نسبت مذکورہ بالا توقعات کا خیال
بالکل غلط اور پادر ہوا ثابت ہوتا ہے۔

اس مدینہ کی تاریخ میں ایسے پُرہول مرقعے نظر آتے ہیں
جنھیں دیکھ کر بے اختیار آنکھ بند کر لینے کو دل چاہتا ہے
اور یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایسے واقعات صحیح ثابت ہوں۔ لیکن
کیا کیا جائے جب کہ واقعات کا وقوع ناقابل انکار حیثیت
رکھتا ہو۔

پہلا مرقع: رسولؐ کی آنکھ بند ہوئی ہے اور بھی کچھ زیادہ
عرصہ نہیں گذرا اُن کی پیاری بیٹی فاطمہ زہراؑ اور اُن کے

عزیز داماد علی بن ابی طالبؑ جن کے عظمت و احترام پاس اور لحاظ کی مرتے مرتے ہدایت کر گئے، وہ ان کے غم میں مبتلا اور گریہ و زاری میں مصروف ہیں اور ادھر ہوا کا رُخ بدل گیا ہے۔

حکومت وقت کی مشین اُن کے خلاف متحرک اور ذمہ داران حکومت کی کارگذاریاں اُن کے صحیح حقوق اور جائز مطالبات کی پامالی میں مصروف ہیں۔

اُس وقت جو واقعات پیش آئے اور رسولؐ کی مبتلائے مصیبت بیٹی کے ساتھ جس قسم کے سلوک روا سمجھے گئے، وہ تاریخ میں محفوظ ہیں اور ہر طالب حقیقت اُن کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

یہ مدینہ ہی تھا اور وہیں کی زمین اور وہ تاجدار مدینہ کی اکلوتی بیٹی تھی کہ جس پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور اُس وقت نہ مدینہ کی فضا میں انقلاب تھا نہ وہاں کے رہنے والوں کو کوئی احساس، فاطمہ زہراؑ مصیبت ہی مصیبت میں دنیا سے گذر گئیں مگر مدینہ کی چہل پہل، وہاں کا صبر و سکون، وہاں کا نظم و نسق، وہاں کی خوشحالی اور رونق سب اپنے حال پر باقی رہا اور اُس میں کوئی تغیّر و تبدل نہ ہوا۔ یہ ہے مدینہ اور یہ ہیں اہل مدینہ اور یہ ہے اُن کا احساس و شعور۔

دوسرا مرقع: مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ جو عام مسلمانوں کے مسلّم فرماں روا تھے اور تمام مسلمانوں کے گلے میں اُن کی بیعت کا حلقہ تھا۔

وہ اسی مدینہ میں محصور ہوں، قتل کیے جائیں۔ تین دن تک لاش بے کفن پڑی رہے اور کسی مسلمان، حضرت عثمان کے ماننے والے کلمہ گو کو یہ توفیق نہ ہو کر وہ اُن کی لاش کو دفن ہی ہو جانے دے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب لکھتے ہیں۔ "عبرت کا مقام ہے کہ خلیفہ دنیا کے بڑے حصّہ کا مالک ہو اُس کی میّت کے ساتھ چار آدمی سے زیادہ نہ تھے اور اس پر بھی بلوائیوں کا یہ حال تھا کہ جنازہ پر پتھر مار رہے تھے اور بیچارے جنازہ اٹھانے والے بھاگے بھاگ جا رہے تھے۔ جب حضرت عثمان کو جنّت البقیع لے گئے تو بلوائیوں نے سخت یورش کی اور کہا کہ ہم مسلمانوں کے قبرستان میں اُن کو دفن نہ ہونے دیں گے۔ آخر مجبور ہو کر یہودیوں کے قبرستان میں جو جنّت البقیع کے برابر تھا اس حامی اسلام اور مسلمان خلیفہ کو دفن کیا گیا۔" (محرم نامہ مطبوعہ دھلی بار دھم صنہ)

اتنا سخت موقع اور اس وقت مدینہ کے لوگ آرام کی نیند سوتے تھے اور خواب و خور میں مصروف تھے۔ مدینہ میں نہ انقلاب ہوا اور نہ وہاں کے لوگوں کو تاثر و احساس۔

تیسرا موقع: پیغمبر اکرمؐ کے عزیز فرزند پیارے نواسے، حضرت امام حسینؑ کے بڑے بھائی امام حسن مجتبیٰؑ اور اسی مدینہ میں زہر سے اُن کا انتقال اور حسینؑ کا اپنے بھائی کو اُن کے نانا رسولؐ کے روضہ پر وداع کے لیے لے جانا اور اس سے بعض طبائع کو یہ تصور

پیدا ہوتا کہ آپ اُنھیں وہاں دفن کرنا چاہتے ہیں اور اس پر
عملی مخالفت کے ساتھ سامنے آکر سدراہ ہوتا پھر تیروں کا کمانوں
سے رہا کیا جانا اور جنازہ پر تیروں کی بارش کا ہو جانا اور
حسینؑ کا اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق لاش کو واپس لے آنا
اور نواسے کا نانا کے جوار میں دفن نہ ہو سکنا۔

یہ کہیں پردیس کا نہیں مدینہ کا تذکرہ ہے اور وہیں کی
تاریخ ہے جو ان تاریک نقوش سے لبریز ہے۔ کیا یہ موقع ایسا
اہم نہ تھا کہ مدینہ کے جسم میں اگر روح ہوتی تو اس میں حرکت
پیدا ہوتی اور کسی قسم کے احساس و شعور کا مظاہرہ کیا جاتا۔
یہ واقعات ہیں جو کربلا والے واقعہ سے قبل رونما ہوئے
اور اس کے بعد بھی برابر اس قسم کے مواقع پیش آتے رہے
ہیں جو مدینہ کی قوت عمل اور جوش ایمانی کی حالت بے نقاب
صورت سے رونما کر دیتے ہیں۔ حسینؑ قتل ہو گئے اور مدینہ
میں آپ کی شہادت کا واقعہ عام طور پر معلوم ہوتا ہے لیکن
اہل مدینہ کی عقیدت یزید کے ساتھ بدستور قائم رہتی ہے
اور وہ اُس کی خلافت کے گرویدہ رہتے ہیں۔

وہ اس موقع پر ایک معمولی سی صدائے احتجاج بلند
کرنے یا ایک ادنیٰ مظاہرہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں
کرتے۔ حرّہ کا واقعہ جس میں مدینہ کے اندر بغاوت برپا ہوئی

اور اُس کا افسوس ناک نتیجہ مدینہ کے قتل عام اور حرم نبیؐ کی
بربادی کی صورت میں نمودار ہوا، وہ واقعۂ کربلا کے قریب
قریب دو سال بعد ہوا۔ وہ اس معنی سے کارنامۂ حسینی کے نتائج
میں سے ضرور ہے کہ یزید کے افعال و اعمال پر نظر ڈالنے کی
توفیق اور اس کا احساس کہ ہمارا خلیفہ کیسا ہے؟ شہید کربلا ہی
کے جرأت مندانہ اقدام نے پیدا کیا مگر یہ سوچنے سمجھنے کی بات
ہے کہ خود قتل حسینؑ اہل مدینہ کے نزدیک جیسے کوئی اتنا بڑا جرم
نہ تھا جو اُن کے لیے یزید کی مخالفت کا باعث ہوتا بلکہ انھیں
ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک وفد بھیجیں جو بچشم خود یزید کے
حالات کا جاکر مطالعہ کرے، چنانچہ اُس وفد کے ارکان نے
جن میں عبد اللہ بن حنظلہ انصاری بھی تھے آکر یہ بیان کیا:۔

انا قد منا من عند رجل لیس له دین یشرب الخمر و
یعزف بالطنابیر ویضرب عنده القیان ویلعب بالکلاب
ویسامر الخرّاب والفتیان۔

"ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جس کا کوئی
مذہب نہیں وہ شراب پیتا اور طنبورہ بجاتا اور گانے والیوں کے
پاس بیٹھتا اور کتوں سے کھیلتا اور رند مشرب آدمیوں کے
ساتھ قصہ کہانیوں میں مصروف رہتا ہے۔"

بس یہ تھا کہ جس کے بعد اہل مدینہ نے یزید کی بیعت سے

علیحدگی اختیار کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کی نظر میں حسینؑ کا قتل ان ظاہری معاصی وجرائم کے ارتکاب کا اتنا وزن نہ رکھتا تھا۔ وہ اسلام کے ظاہری رسوم اور احکام کو روح اسلامی کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ سمجھتے اور ان کی مخالفت سے زیادہ متاثر ہوتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ان واقعات کے مشاہدہ کی تاب نہ لاکر مخالفت پر آمادہ ہو گئے مگر حسینؑ ابن علیؑ کی شہادت پر ایک معمولی سی جنبش بھی پیدا ہونے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

ائمہ اہلبیتؑ جو اپنے زمانہ میں خاندان رسولؐ کے نمایاں افراد اور اس گھرانے کے چشم و چراغ اور بزرگ خاندان ہوا کرتے تھے وہ اسی مدینہ میں اپنے جدامجد کے جوار میں مقیم تھے لیکن مدینہ نے اُن کی حفاظت وحمایت میں کبھی کسی طرح کا حصہ نہیں لیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسی مدینہ سے امام موسیٰ بن جعفرؑ قید کیے گئے اور اسی مدینہ سے امام رضاؑ بجبر بلائے گئے اور اسی مدینہ سے امام محمد تقیؑ پابند و گرفتار کر کے لے جائے گئے مگر کیا مدینہ میں اُن کے لیے کچھ ہوا اور اہل مدینہ نے اُن کے لیے کوئی کوشش حفاظت کی ؟ ہرگز نہیں۔ اب تک تو کسی تاریخ میں ہماری نظر سے نہیں گذرا ہے۔

کیا ان تلخ واقعات کے ہوتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ

امام حسینؑ نے مدینہ میں قیام کیوں نہ کیا؟ اگر وہ وہاں رہتے تو مدینہ والے جو آپ کے نانا کے مخصوص اصحاب اور تابعین تھے آپ کی حفاظت میں جان لڑا دیتے اور کسی طرح آپ کی امداد میں کوتاہی نہ کرتے؟

یہ صحیح ہے کہ وقتی حیثیت سے ولید کا طرزِ عمل آپ کے متعلق ملائم تھا اور وہ جیسا کہ اُس کی مذکورہ سابق تقریر سے ظاہر ہے کسی طرح آپ کے قتل کو پسند نہ کرتا تھا لیکن کیا اُس کا طرزِ عمل اسی صورت میں باقی رہ سکتا تھا؟

کیا مروان ایسا دشمن خاندان رسولؐ جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے کو وہ سخت قابل اعتراض سمجھا تھا یا اُس کے ایسے دوسرے ہواخواہ یزید کو اطلاع نہ دیتے اور اس صورت میں یا تو ولید ہی کو پھر مجبور ہو کر بادل ناخواستہ کوفہ کے عمر بن سعد کی طرح حسینؑ کے قتل کا بیڑا اُٹھانا پڑتا اور یا اُس کو معزول کر کے یزید کی طرف سے کسی دوسرے قسی القلب مروان یا دوسرے کسی شخص کو حاکم بنا دیا جاتا جو قتل امام حسینؑ میں کسی مذہبی احساس سے متاثر نہ ہوتا اور اس مقصد کو انجام دیتا۔

اس صورت میں امام حسینؑ شہید بھی ہوتے اور پھر آپ کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور جس طرح اس کے

بل امام حسنؑ کو زہر دلوا کر شہید کیا گیا لیکن اُس سے براءت
کی گئی اس طرح کہ اُس واقعہ کو ایک طبقہ کی نظر میں مشکوک
ن دیا، اسی طرح امام حسینؑ کی شہادت کو غیر معلوم اسباب و
علل کا نتیجہ بنا کر دنیا کے سامنے حقیقت حال کو مشتبہ کر دیا جاتا۔
امام حسینؑ کے لیے موجودہ حالات میں تدبر کا اقتضا، یہی تھا
کہ وہ اپنی مذہبی خودداری کی حفاظت کے لیے وقتی حیثیت
سے مدینہ کو ترک کر دیں اور کسی اور طرف کا رُخ کریں۔
انسان کے لیے یہ ایک مستقل مصیبت ہے کہ وہ غیر متوقع
حالات کی بناء پر یک بیک اپنے وطن کی زندگی کو ترک کر کے
مسافرت اختیار کرے اور پھر جب کہ وطن کے اندر اُس کے
لیے مخصوص جذب کے وجوہ پائے جاتے ہوں۔
امام حسینؑ کو مدینہ کو ترک کرنا جتنا ناگزیر تھا اُتنا ہی آپ کو
مدینہ سے مسافرت اختیار کرنا ناگوار بھی تھا۔ اس لیے کہ یہاں
نانا کا جوار اور ماں کی لحد اور بھائی کا مزار آپ کی توجہ کے مخصوص
مرکز تھے اور آپ کو خاک وطن اور اعزہ سے جدا ہونا اتنا شاق
نہ تھا جتنا ان مقدس مزارات سے علیحدہ ہونا۔ چنانچہ آپ نے
اُس شب کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مدینہ کے باہر نکل
چکے تھے صرف انہی اپنے گذشتہ بزرگوں سے رخصت ہونے
کے لیے مخصوص کیا۔

آپ اپنے جد امجد حضرت محمد مصطفےٰؐ کی قبر مطہر سے رخصت ہوئے اور وہاں آپ کی حالت بہت دگرگوں ہوئی۔ چاہنے والے نانا کا زمانہ اور تمام محبتیں نظروں کے سامنے پھر گئیں۔ اور یہ انقلاب زمانہ کا کہ اُسی نانا کے اس سب سے محبوب نواسے سے آج یزید جیسے شرابخوار فاسق و فاجر کی بیعت طلب ہو رہی تھی اور اُس کے واسطے اپنے نانا کے جوار میں رہنے کے لیے اُن کے مدینہ کی زمین تنگ ہو گئی تھی۔

بس یہ اسباب تھے کہ امامؑ کا دل یہاں اُمنڈ آیا اور قبر سے مل کر بہت روئے، یہاں تک کہ روتے روتے ظاہری آنکھوں کے سامنے خواب کا ایسا پردہ پڑا کہ حضرت رسولؐ نواسے کو تسکین دیتے ہوئے نظر آئے۔

نواسے نے رو رو کر نانا سے امت کا شکوہ کیا اور یہ کہا کہ ادخلنی فی قبرک "اے نانا اس سے تو یہ بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنی قبر میں لے لیجیے"۔ لیکن رسولؐ نے حسینؑ کی زندگی کے آئندہ کارنامہ کے متعلق پُرکیف بشارت دی اور حسینؑ ایک جدید روح، عزم و استقلال کے ساتھ خواب سے بیدار ہوئے ابھی رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ کی صبح بے رونق تھی اس لیے کہ حقیقی آفتاب اُس کا آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی اس لیے کہ رسولؐ کا

نور دیدہ آج صحرائے غربت میں گامزن تھا۔

پانچواں باب
حرم خدا کی پناہ

انسان کا آخری نتیجہ سے واقف ہونا اور بات ہے اور مصالح حاضرہ کی بناء پر اُس کے طریقۂ عمل کا تعین دوسری بات، امام حسینؑ کسی غیر معمولی روحانی طاقت کے مالک ہونے کی بناء پر ربانی الہام اور علم مخصوص امامت کی وجہ سے (جیسا کہ حقیقت ہے اور شیعوں کا مسلم عقیدہ ہے) یا ایک دانشمند حالات حاضرہ سے مطلع شخص کی حیثیت سے واقعات و تجربات اور بنی امیہؔ کی سیاسی افتاد طبع کے لحاظ سے (جیسا کہ عام افراد خیال کر سکتے ہیں) بہرحال واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ صورتِ حال کے آخری نتیجہ اور اپنے انجام قتل سے واقف تھے اور اسے ناگزیر امر خیال کرتے تھے لیکن واقعات کی رفتار کے تدریجی حیثیت سے متغیر ہونے کی بنا پر ظاہری طور پر آپ کے نصب العین کا تبدیل ہونا ضروری تھا۔

چنانچہ اس موقع پر جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لائے ہیں آپ کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ آپ حفاظت خود اختیاری کے اصول پر ایک تو اپنے کو کسی ایسی محفوظ جگہ پہونچا دیں جہاں آپ کی جان کو نقصان پہونچنے کا خوف نہ ہو اور پھر وہاں آپ کو بیعت یزید سے کنارہ کش رہنے کا بھی موقع حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے آپ کو حرم خدا مکۂ معظمہ سے بہتر کوئی جگہ نظر نہ آئی اس لیے کہ وہاں عرب کے قدیم روایات اور اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جانور تک کا قتل جائز نہیں۔ امام نے یہاں پہونچ کر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش پناہ میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خاموشی کی زندگی گذارنے لگے۔ نہ امور سلطنت سے غرض اور نہ مہمات مملکت سے کوئی تعلق۔

وہ لوگ جو حضرت کی طرف سلطنت طلبی و جاہ پسندی کا الزام عائد کرتے ہیں وہ اس موقع پر حضرت کے طرز عمل کا مشاہدہ کریں اور یہ دیکھیں کہ اگر آپ کو یزید کے خلاف کسی سلطنت کی بنیاد قائم کرنا ہوتی تو آپ مکۂ معظمہ سے خطوط و رسائل روانہ فرماتے اور مختلف اطراف کے لوگوں کو اپنی نصرت کی دعوت دیتے لیکن تاریخ اس کا

پتہ دینے سے قاصر ہے اور یقیناً حضرت کا مکۂ معظمہ سے ایک خط بھی ایسا نہیں گیا ہے جس میں آپ نے کسی کو یزید کے خلاف مشتعل یا اپنی نصرت پر آمادہ کیا ہو۔

بے شک خود آپ کے مکۂ معظمہ سے اس زمانہ میں قیام کا جب کہ تمام اطراف سے حجاج جمع ہو رہے تھے اور تمام ملک عرب کے افراد کا اجتماع تھا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف حلقوں میں آپ کے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر مکہ میں قیام کے متعلق تبادلۂ خیال اور بحث و جستجو ہو اور آپ کے اخلاق و اوصاف کی پسندیدگی اور امن و اماں کی حفاظت میں آپ کی خاموشی جو صحیح اسلامی تعلیمات کا مکمل نمونہ تھی اور اس کے برخلاف یزید کے چشم دید یا گوش شنید حالات سے جن میں اس کے برعکس صفات کا مظاہرہ تھا لوگوں کو حق و باطل کے موازنہ کا موقع حاصل ہو اور عام افراد آپ کی مظلومانہ لیکن بے پناہ جنگ کو اور پھر اُس کے بعد آپ کی فاتحانہ لیکن پُر درد شہادت کو جس کا ہونا اُس کے بعد ضروری تھا خالی الذہن ہونے کی بنار پر غیر معلوم اسباب و علل کا نتیجہ نہ قرار دیں بلکہ اسباب و وجوہ پورے طور سے اُن کو معلوم رہیں اور اس کے بعد ممکن ہے اُن کے دلوں میں احساس اور ہاتھ پیروں میں قوت اقدام و عمل پیدا ہو اور وہ ایک وقت

میں حق کی فتح اور باطل کی شکست کا مکمل ذریعہ قرار پائے۔
اس کی مزید تشریح ابھی آئے گی، جب ہم آنے والے باب
کے خاتمہ پر امام حسینؑ کے سفر کی تبلیغی افادیت پر روشنی ڈالینگے

چھٹا باب

عراق کا سفر

امام حسینؑ کا مکہ معظمہ میں قیام بیعت یزید سے علیحدگی کے بعد ایک گوشۂ عافیت میں امن وامان کے ساتھ بیٹھے رہنے کی حیثیت سے تھا اور یہی وہ مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد بن الحنفیہ نے پیش کیا تھا جسے آپ نے پسند فرمایا۔ لیکن مکہ میں حالات کے سازگار نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی ان نبت بك لحقت بالرمال وشعف الجبال وخرجت من بلد الی بلد حتی تنظر الی ما یصیر امر الناس و تعرف عنه ذلك الرای۔

"اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل

جائیے گا ریگستانی صحراؤں میں اور پہاڑوں کے دامنوں میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اُس وقت کوئی مختتم رائے قائم کیجیے۔" (طبری ج ۶ ص ۱۶۱)

امام حسینؑ کے سامنے یہ سوال ابھی پیش از وقت تھا کہ مکہ کے بعد پھر کہاں؟ آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے مدنظر نہ تھا لیکن حالات کا تقاضا یکساں نہیں رہتا۔

کوفہ میں یہ خبر پہونچی کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور یزید تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ یزید کیسا شخص ہے؟ اُس کے اوصاف و افعال کا بھی عام طور پر تذکرہ ہونے لگا اور لوگوں میں خاص اضطراب و تلاطم کی صورت نظر آنے لگی عین اسی موقع پر یہ خبر بھی معلوم ہوئی کہ حسین ابن علیؑ نے یزید کی بیعت کو منظور نہیں کیا ہے اور آپ اُس سے علیحدگی اختیار کر کے مکہ معظمہ میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔

اس موقع پر جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ "قاتلان حسینؑ کا مذہب" میں لکھا ہے اُن معدودے چند شیعوں کو جو کوفہ کے اندر قتل ہونے، سولی پانے، قید کیے جانے کے بعد بچ رہے تھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے بہتر موقع حالات کے

سازگار ہونے کا نہیں مل سکتا۔ اس وقت اگر کوفہ کی فضا
آلِ رسول ص کے لیے ہموار ہو گئی تو یقیناً مدّت کے صبر آزما
مظالم کے بعد ایک بڑی کامیابی ہو گی اور یہ سوچ کر سلیمان
بن صرد صحابی رسول ص کے گھر میں اجتماع ہوا اور اس موقع
سلیمان نے مجمع کو مخاطب کر کے جو تقریر کی ہے وہ حسب ذیل ہے

ان معاویۃ ھلک وان حسینا قد تقبض علی القوم
ببیعتہ وقد خرج الی مکۃ وانتم شیعتہ وشیعۃ ابیہ
فان کنتم تعلمون انکم ناصروہ ومجاھدو عدوہ
فاکتبوا الیہ وان خفتم الوھن والفشل فلا تغرّوا الرجل
عن نفسہ۔

"معاویہ کا انتقال ہوا اور حسین ع نے یزید کی بیعت سے انکار کیا
ہے اور وہ مکہ معظمہ چلے گئے ہیں۔ آپ لوگ ان کے اور ان کے
پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں، اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے
ہوں کہ اُن کی نصرت و مدد میں اور اُن کے دشمنوں سے
جنگ میں کوتاہی نہ ہو گی تو بسم اللہ اُن کو خط لکھیے اور اگر
سستی و کمزوری کا خوف ہو تو برائے خدا ایک شخص کو فریب
دے کر اُس کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔

اس تقریر سے اور واقعات کے مطالعہ سے حسب ذیل
نتائج صاف طور سے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) امام حسینؑ کا بیعت یزید سے کنارہ کشی کرنا اور مدینہ سے روانہ ہونا کسی خارجی تحریک اور اہل کوفہ کے ساتھ کسی متقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھا۔

(۲) حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے اور وہاں آپ حکومت و ریاست کے مالک ہوں گے۔

(۳) حضرت نے مکہ پہنچنے کے بعد خود کسی قسم کی تحریک کوفہ کے اندر نہیں کی اور نہ وہاں اپنے مقاصد کی تبلیغ ہی ضروری سمجھی۔ بلکہ اس وقت تک امام کو کوفہ کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں ہے۔ اب اس کے بعد جو صورت حال پیش آئے، اُس کے بعد کے اسباب کا قہری نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

سلیمان نے تقریر کی اور سب لوگوں نے یہ اقرار کیا کہ ہم سچے دل سے امامؑ کی نصرت پر آمادہ ہیں اور اپنے کو حضرت کے قدموں پر نثار کریں گے۔

اس کے بعد خط لکھا گیا امامؑ کی خدمت میں جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

لحسین بن علی من سلیمان بن صرد والمسیب بن نجبۃ ورفاعۃ بن شداد و حبیب بن مظاہر و شیعتہ من المومنین والمسلمین من اہل الکوفۃ۔

اس کے بعد معاویہ کے انتقال پر اظہار مسرت کیا گیا تھا

لکھا تھا کہ

انه ليس علينا امام فاقبل لعل الله ان يجمعنا بك على الحق والنعمان بن بشير في قصر الامارة لسنا نجتمع معه في جمعة ولا نخرج معه الى عيد ولو قد بلغنا انك قد اقبلت الينا اخرجناه حتى نلحقه بالشام ان شاء الله والسلام ورحمة الله۔

"ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے لہذا آپ تشریف لائیے، شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر ہم آہنگ ہو سکیں اور نعمان بن بشیر دار الامارہ میں موجود ہیں ہم اُن کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے اور نہ عیدگاہ جاتے ہیں اگر ہم کو خبر معلوم ہو جائے گی کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اُنھیں نکال کر شام جانے پر مجبور کر دیں گے والسلام!"

اس خط کو عبداللہ بن سبیع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا یہ سب سے پہلا خط ہے جو امام کو مکہ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا۔

گذشتہ خط کے بعد یہ تحریک بجلی کی طرح تمام حلقوں میں پھیل گئی اور دو دن کے عرصہ میں ۵۳ عرضداشتیں تیار ہو گئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور وہ قیس بن مسہر صیدادی اور عبدالرحمن بن عبداللہ بن کدر

ارجبی اور عمارۃ بن عبید سلولی کے ہاتھ روانہ کی گیئں۔ اسی کے دو دن کے بعد پھر ایک خط لکھا گیا جس میں لکھا تھا۔

لحسین بن علی من شیعتہ من المؤمنین والمسلمین

اما بعد فحی ھلا فان الناس ینتظرونک ولا رأی لھم فی غیرک فالعجل العجل والسلام علیک۔

"جلدی تشریف لائیے۔ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کے متعلق خیال نہیں رکھتے ہیں۔ جلدی کیجیے جلدی!"

اس خط کو ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبد اللہ حنفی کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ پانچ دن کے اندر ۵۵ خط اہل کوفہ کی جانب سے حضرت کی خدمت میں پہونچے۔ جن میں صاف اظہار محبت و عقیدت کے ساتھ کوفہ کی طرف تشریف آوری کا مطالبہ ہے اور آپ کی حمایت و حفاظت کا وعدہ۔

یہ مسئلہ کہ ان خطوط کی نوعیت کیا تھی اور ان میں جو دعاوی و مواعید نصرت ہیں اُن میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے اور یہ کہ اُن کے لکھنے والے شیعہ تھے یا کون اور اُنھوں نے اپنے وعدہ پر کس حد تک وفا کی کوشش کی اور اس میں کن وجوہ سے ناکامیابی ہوئی یا کوتاہی؟ ہماری اس کتاب

کے موضوع سے خارج ہے اور اس کے لیے ہمارا رسالہ "قاتلان حسینؑ کا مذہب" ملاحظہ کے قابل ہے۔

اس جگہ تو ہمیں حضرت سید الشہداءؑ کے متعلق غور کرنا ہے کہ حضرت کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیئے؟ صورتِ حال ناظرین کے پیش نظر ہے یعنی حضرت بیعت یزید سے کرنا نہیں چاہتے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا پر کہ یا بیعت لی جائے آپ سے یا قتل کیے جائیں، ناممکن ہو چکا ہے۔

مکۂ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تا بکے؟ جب کہ یزید کے اخلاق و عادات اور احکام مذہبی کے مقابلہ میں خود سری سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ صرف مکۂ معظمہ کے مذہبی احترام کی بنا پر اپنے ایک (بخیال خود) حریف سلطنت کو مکہ میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے دے گا پھر جب کہ یہ خطرہ موجود ہے کہ مکہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہو گا کہ وہیں مکہ میں آپ پر فوج کشی ہو اور مکہ کے اندر کوئی ایسی جماعت نہیں جو آپ کی حمایت کا بیڑا اٹھاتی ہو تو اس صورت میں آپ مکۂ معظمہ میں قیام کر کے مکہ کے اندر خوں ریزی کے باعث خود ہوں! کس لیے؟

رسولؐ کے نواسے کی ہجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے۔ مگر طائف ہو یا یمن۔ بصرہ ہو یا یمامہ، کہیں سے کوئی

آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں
اور آپ کی حفاظت کے لیے تیار۔
اس موقع پر عرب کے آباد ترین خطہ ملک (عراق) اور
اُس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ
ہمارے یہاں آیئے اور ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے
ہر طرح تیار رہیں اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ ایک
دو اور دس بیس سے گزر کر پچپن عرض داشتوں تک نوبت
پہونچتی ہے اور پانچ قاصد یکے بعد دیگرے روانہ ہوتے
ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص جن کی
محبت و صداقت پر بھی آپ کو کامل اعتماد ہے جیسے حبیب
بن مظاہر۔ سلیمان بن صرد۔ رفاعہ بن شداد وغیرہ۔
اس صورت میں یہ نہ دیکھیے کہ بعد میں صورت حال
کیا نمودار ہوئی کیونکہ وہ تو بعد کے وقتی اسباب کا نتیجہ ہوگی۔
آپ اس امر سے بالکل خالی الذہن ہو کر کہ بعد کو حالات
کی رفتار کیا ہوئی اور کس طرح اس میں انقلاب ہوا بس یہ
دیکھیے کہ اب موجودہ حالات میں امام حسینؑ کو کیا کرنا چاہیے؟
یہ نہ کہیئے کہ شیعی عقائد میں امامؑ کو آئندہ ہونے والے
واقعات کا علم ہوتا ہے لہذا امام کے طرز عمل میں آئندہ کے انقلابات
بھی نظر انداز نہیں ہو سکتے۔ یہ کہنا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ

امام بھی اپنے طرزِ عمل میں شریعت ظاہر کے رو سے اسباب ظاہری کے پابند ہیں اور وہ دنیا کی زندگی بحیثیت ایک انسان کے گزارنے پر مامور ہیں اور ان کے روحانی، قوی اور غیر معمولی، اسباب و ذرائع حکم خدا کے ماتحت غیر معمولی حالات میں معجزہ و کرامت کے اظہار کے موقع پر صرف ہونے کے لیے ہوتے ہیں، نہ اپنے روزمرہ کے نظام زندگی اور معاملات میں اُن سے کام لینے کے لیے، اس لیے اُن کی روزمرہ کی زندگی اور اُن کے افعال و عادات کو بس اسی اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ وہ ایک کامل دانشمند انسان اور ایک حکیم و مدبر ہیں جن کے افعال کو مصالح و حکم کے خلاف نہ ہونا چاہیے کہ غیر دانشمندی و سوء تدبیر کا الزام عائد ہو سکے۔

اب یہ دیکھیے کہ مکہ معظمہ میں قیام کی صورت میں بھی آپ کا شہید ہونا تو یقینی تھا یعنی ضرور جیسے عبداللہ بن زبیر پر اُن کے مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے۔ اسی طرح آپ پر اسی مکہ میں فوج کشی ہوتی اور وہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا لیکن کیا اس وقت میں جب کہ کوفہ سے اتنے سخت اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت دی جا چکی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا اور آپ اس دعوت و مطالبہ کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام فرماتے اور وہاں آپ شہید کیے جاتے

یہی اشخاص جو آج حسینؑ پر اعتراض کر رہے ہیں یہی یہ
کہنے نہ اٹھ کھڑے ہوتے کہ کون سی عقلمندی تھی کہ ایک
اتنے بڑے خطہ کی دعوت و وعدہ نصرت کو رد کر دیا جہاں
کے لوگ آپ کے والد کی نصرت کر چکے تھے۔ آپ کی محبت
کا دم بھرتے تھے اور اس وقت بجان و دل آپ کی حمایت
کا وعدہ کر رہے تھے اور سیکڑوں عرض داشتیں بھیج کر
آپ کی تشریف آوری کی خواہش کر رہے تھے اور آپ
نے اتنے نادر موقع کو ہاتھ سے دے کر مکہ میں قیام رکھا
جہاں کہ بے آب و گیاہ زمین۔ بے حوصلۂ جنگ و امنگ رہنے
والے اور بے مہر و محبت افراد۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ قتل بھی
ہوئے اور مکہ معظمہ کی حرمت کے بھی برباد ہونے کا باعث ہوئے
کیوں۔ کیا یہی کہا نہ جاتا؟ بے شک یہی کہا جاتا اور
یقیناً وقتی حالات کی بناء پر حق بجانب کہا جاتا اس لیے کہ
موجودہ حالات میں عقل و تدبر کا اقتضا یہی ہے کہ ان بلانے
والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے عدوں
کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ بھی ہوں تب بھی ان پر
اتمام حجت کی جائے۔ بے شک تھے ایسے لوگ جو آپ کو
عراق جانے سے منع کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ عراق
والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں مگر وہ اس پہلو کو نظر انداز

کیے ہوئے تھے کہ کیا مکہ معظمہ میں آپ کا قیام قتل ہونے سے
آپ کو بچا دے گا؟ بلکہ حقیقۃً اگر موازنہ کیا جائے تو موجودہ
حالات کے لحاظ سے مکہ میں قیام کی صورت میں قتل ہونا
یقینی اور کوفہ کی طرف روانگی کی صورت میں مشکوک. اس
لیے کہ اہل کوفہ کے مواعید کا غلط ہونا کسی یقینی وجوہ پر
مبنی نہیں بلکہ صرف اُن کی افتاد طبع کے متعلق ایک غیر منتقیٰ
حکم کی صورت رکھتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ اہل کوفہ کا وہ تاکیدی
اور شدید اصرار بلکہ الحاح وزاری کہ ہمارا کوئی رہنما
نہیں اور تشریف لائیے اور ہم آپ کی نصرت کریں گے
اور آپ کی امداد۔

اور آپ اس تمام الحاح وزاری۔ خواہش و اصرار
کو یہ کہہ کر مسترد فرمائیں کہ ہمیں تمہارے وعدوں کا یقین
نہیں تو یہ انسانی اخلاق و مروت کے فرائض سے کتنا
علیحدہ طرز عمل ہے جس کو کسی طرح ستائش کے قابل
نہیں سمجھا جا سکتا، اور پھر جب اس کے ساتھ آپ مکہ معظمہ
میں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت سے
کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا ضروری نہیں ہے۔
لیکن جب کہ اہل کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک

رکھتے ہوئے۔ نوع انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں۔ تو اب اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مروت کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظت خود اختیاری کے اصول پر بحد امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے کو مکہ معظمہ سے علیحدہ کرتے ہوئے مکہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔ اسی لیے وہ لوگ جو آپ کو عراق جانے سے مانع ہوتے تھے اُن کے جواب میں آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے اور وہاں میں اگر جاؤں گا تو یقیناً وہ میری نصرت کریں گے اور میرے لیے تاج و تخت حاصل ہوگا اور میں عراق میں ایک بادشاہ کی حیثیت حاصل کر لوں گا۔" ہرگز نہیں۔ بلکہ آپ نے زیادہ تر عراق کے متعلق اُن کی بے اطمینانی اور بے اعتمادی کو صحیح تسلیم فرماتے ہوئے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور سے قائم رہنے کا اظہار فرمایا ہے اور کبھی صاف کہہ دیا ہے کہ میں یہاں بھی رہوں گا تو قتل ہوں گا اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا

جیسا کہ عبد اللہ بن زبیر سے فرمایا ہے کہ

ان ابی حدثنی ان بہا کبشا یستحل حرمتہا فما احب ان اکون انا ذلک الکبش۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہوگا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی میں وہ مینڈھا نہیں بننا چاہتا۔" (طبری ج ۶ ص ۲۶۷)

دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد آپ نے اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا، جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمائیے اور باہر نہ جائیے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا:

واللہ لئن اقتل خارجا منہا بشبر احب الیّ من اقتل داخلا منہا بشبر وایم اللہ لو کنت فی جحر ہامۃ من ہذہ الہوام لاستخرجونی حتی یقضوا فی حاجتہم و اللہ لیعتدن علی کما اعتدت الیہود فی السبت

"خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکہ کے حدود سے باہر قتل ہوں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے

ٹھہرے آئیں گے۔ یہاں تک کہ جو چاہتے ہیں میرے ساتھ وہ سلوک کریں۔ خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کریں گے جس طرح یہود نے روز شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا۔

(طبری ج ۶ ص ۲۶۷)

ان وجوہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یقیناً آپ کے لیے کوفہ تشریف لے جانے کی ضرورت ہے اور آپ کے لیے اہل کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب نہیں ہے۔

لیکن اس کے بعد بھی امامؑ نے احتیاطی کارروائی یہ فرمائی کہ اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیلؑ کو اپنا نمایندہ بنا کر کوفہ روانہ کیا اور ایک تحریر لکھی جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من حسین بن علی الی الملأ من المؤمنین والمسلمین اما بعد فان ھانئا و سعید اقد ما علیّ بکتبکم فکانا اخر من قدم علیّ من رسلکم وقد فھمت کل الذی اقتصصتم و ذکرتم ومقالۃ جلکم انہ لیس علینا امام فاقبل لعل اللہ ان یجمعنا بک علی الھدیٰ والحق وقد بعثت الیکم اخی وابن عمی وثقتی من اھل بیتی وامرتہ ان یکتب الیّ بحالکم وامرکم ورأیکم فان کتب الیّ انہ قد اجمع رای ملأکم وذوی الفضل والحجیٰ منکم علی مثل ما قدمت علیّ بہ رسلکم

وقرأت فی کتبکم اقدم علیکم وشیکا انشاء اللہ۔

"ہانی اور سعید تمہارے خطوط لے کر آئے اور یہ دونوں آخری شخص ہیں جو میرے پاس تمھاری طرف سے پہونچے ہیں۔ میں نے تمھارے تحریرات کو پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ ہمارے سروں پر کوئی امام نہیں آپ آئیے شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کر دے۔ اس بنا پر میں تمھاری جانب اپنے بھائی اور چچا کے بیٹے اور اپنے محل اعتماد عزیز کو روانہ کرتا ہوں۔ اور انھیں حکم دیا ہے کہ وہ مجھ کو تمہارے حالات و خیالات سے مطلع کریں اگر انھوں نے مجھے لکھا کہ تمہاری جماعت اور اہل حل وعقد افراد اسی بات پر متفق ہیں جو تم نے اپنے خطوط میں تحریر کیا ہے تو میں بہت جلد تمہاری طرف روانہ ہوں گا انشاء اللہ"

یہ خط لے کر حضرت مسلمؑ روانہ ہوئے اور کوفہ پہونچے۔ یہاں صورت حال انتہائی خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئی۔ کوفہ کی خلقت نے حضرت مسلمؑ کی نمایندگی کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور یہ حالت ہوئی کہ ایک ہفتہ میں اٹھارہ ہزار آدمیوں نے حضرت مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ بیعت کس طرح کی تھی اور بیعت کرنے والے کون لوگ تھے؟ اس کے لیے ملاحظہ ہو "قاتلان حسینؑ کا مذہب"۔

اس خوشگوار صورتِ حال کا نتیجہ تھا کہ حضرت مسلمؑ نے امامؑ کو خط لکھ دیا کہ جلد تشریف لائیے۔ حالات سازگار ہیں اور اہل کوفہ اپنے قول و قرار پر قائم۔

بس یہ آخری بات تھی کہ جس کے بعد امام حسین علیہ السلام کے لیے کوفہ کی روانگی یقینی طور سے ضروری ہو گئی لیکن اس کے بعد بھی اتنی جلدی کی ضرورت نہ تھی کہ آپ حج کا زمانہ آنے کے بعد صرف دو دن باقی رہے حج کو ترک فرمائیں۔ بلکہ آپ کی افتادِ طبیعت اور ذوقِ عبادت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری موقع تھا تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ حج کی تمامیت کو ایک دن باقی اور آپ نے اس قریبی وقت میں ایک مرتبہ حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ معظمہ سے روانگی اختیار فرما لی۔ اس کے اسباب جو کچھ بھی ہوں وہ ایسے نہیں ہیں کہ جو منظرِ عام پر نمایاں اور عام افراد کے زیرِ اطلاع ہوں۔

حرمِ الٰہی کے اندر کوئی فوج و لشکر نہ تھا جسے سب ہی دیکھتے مگر حجاج کے لباس میں فوج کے سپاہی اور انھیں ہدایت کہ حسینؑ جس حال میں ہوں وہاں اُن کو گرفتار کر لو۔

لوگوں کو اس سبب کا علم اس وقت ہوا جب آپ مکہ سے باہر آچکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور کہا بابی وامی یا ابن رسول اللہ ما عجلك عن الحج۔

"فرزند رسولؐ اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا"

فرمایا لو لم اعجل لاخذت "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا"

بس یہ تھا جس نے حسینؑ کو عراق کی طرف روانگی پر مجبور کیا۔ اور آپ کو حرم خدا سے بھی رخصت ہو کر رہ سپار سفر غربت ہونا پڑا۔

حسینؑ کا اقدام عمل خالص تبلیغی شان رکھتا تھا

اور

تدبر و سیاست کا بہترین نمونہ تھا

امام حسینؑ مدینہ سے اس بات کا بیڑا اُٹھا کر نکلے تھے کہ دنیا کے سامنے حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیں، چنانچہ آپ نے اپنے مقصد کی اشاعت اور یزید کے ننگ انسانیت افعال کو طشت از بام کرنے میں وہ تمام وسائل و ذرائع اختیار

کیے جو آپ کے عظیم تدبر و سیاست کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ حسینؑ نے مدینۂ رسولؐ کو چھوڑنے کے بعد مکہ معظمہ کو اپنے قیام کے لیے منتخب کیا۔ مکہ معظمہ کا قیام بظاہر اس لیے تھا کہ اس مقام مقدس میں خوں ریزی حرام ہے لہذا آپ کی زندگی دشمنوں کے خطرہ سے محفوظ رہے گی لیکن یہ نقطۂ نظر ایسے شخص کے لئے تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ کہ جو مرنے پر کمر باندھ چکے تھے اور پورے طور سے آخر تک ہونے والے واقعات پیش نظر رکھتے تھے جس کو برابر الفاظ میں بتلاتے بھی رہتے تھے ان کی نسبت اس خیال کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکۂ معظمہ قلب جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا مرکز تھا، اطراف و جوانب کے قافلے برابر آتے رہتے تھے اور علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت اشہر حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کو باطل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب

کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا وہ مشہور کانفرنسیں جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھیں جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے۔ ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ و طائف و مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔

امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی۔ اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسینؑ کو اُن کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسولؐ کا نواسا، سلطان حجاز و عراق کا فرزند، ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی و جواد جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا بزرگ خاندان، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو اُن کے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت امام حسینؑ نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لیے تجویز کیا۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ آپ اپنے لیے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ روابط بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کا خیال رکھتے تھے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر آپ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ اس میں

کامیابی نہ ہوتی۔

یمن بالکل نزدیک تھا جس کا اسلام علیؑ بن ابی طالبؑ کا رہین منت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو علی بن ابیطالبؑ اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔

طائف بھی کچھ اولادِ رسولؐ کا مخالف نہ تھا لیکن فرزند رسولؐ کو عالم گیری اور جہاں بانی کا شوق نہ تھا، وہ اپنے کو ایک عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے۔ آپ کا قیام مکہ معظمہ میں صرف اس لئے تھا کہ جمہور عرب کے اندر صورت حالات کی طرف ایک توجہ پیدا ہو جائے اور یزید کے افعال و اعمال کا چرچا ہونے لگا۔

حسینؑ کے قتل کے لیے حجاج کے لباس میں شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا حضرت کے پابہ زنجیر کر لیے جانے کا سامان کیا گیا ہو، بہرحال نامعلوم اسباب و علل کے ماتحت امامؑ کا بیت الحرام سے رخصت ہونا اور زمانہ حج کے گذرنے کا انتظار بھی نہ کرنا، اس کو امامؑ کے تبلیغی مقصد میں پورا دخل ہے

ایکا ایکی خلاف توقع حسینؑ کا حج کو ترک کر دینا اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائل عرب کے

نمایندوں میں ایک لہر دوڑا دی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع پر قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

حسین بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ ان تمام اہل و عیال و اقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟ (حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے) لاحول ولا قوۃ، بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ فرزند رسولؐ اور یزید ایسے شراب خوار اور زناکار اور فاسق و فاجر کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی ترک کر دیا؟ جان کا خطرہ تھا شاید مکہ میں حسینؑ کے قتل کرنے کے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے، توبہ توبہ! اس سے بڑھ کر سفاکی و ظلم کیا ہوگا کہ فرزند رسولؐ کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے؟

یہ تذکرے وہ ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جاری تھے۔

وہ زمانہ کہ جب طرق مراسلت و مخابرت مسدود تھے تار، ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے

بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا ہوا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ کی نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ امام کے لیے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے لیکن مطلب صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے کے سبب آپؑ کی شہادت عام طور سے نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہ پائے جس سے اہل شام کو اپنے دل سے اس کے لیے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے اور حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت مخفی ہو جائے۔ یقیناً اگر امامؑ کی طرف سے ان طرق نشر و اشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے امامؑ کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسینؑ کا خون رائگاں چلا جاتا، بایں معنی کہ آپ اپنی جان بھی ہاتھ سے کھوتے اور کوئی ہمدردی بھی افراد بشر کے قلوب میں چھوڑ کر نہ جاتے اور نہ وہ مقصود جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر اب کیا ہوا؟ کہ امامؑ شہید ہوئے تو تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق شہید کیے گئے، شام کا حاکم اور اس کے دشمن انسانیت وزرا اور ساتھی کسی تہمت تراشنے کا موقع نہ پا سکے۔

اسے خداوند عالم کی قوت قاہرہ کے بعد حسینؑ کے تدبر سے تعلق ہے اور وہ اسباب و علل شہادت کے نشر و اشاعت کا نتیجہ تھا۔ حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے وجوہ کو زندگی ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سرِ تسلیم کو خم کرا لیا اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ کیا ہو سکتی ہے؟

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے، ادھر امام حسینؑ اپنے اہل و اقربا، اور انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لیے ایک بڑے قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گذارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ پھر کہاں امام حسینؑ کا شاندار قافلا اور اصحاب و اعوان کا مختصر لشکر۔ اس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے ہے مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جب کہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لیے متوجہ ہے! یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ اور

کہاں جا رہا ہے اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کیے ہیں۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فرزدق کی ملاقات امامؑ سے یوں ہی اتفاقی طور پر ہوی تھی اور عبداللہ بن مطیع اور عمر بن عبدالرحمٰن مخزومی بھی راستے میں خلاف توقع امامؑ سے دوچار ہو گئے تھے اور پھر جو گفتگو ہوی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسین بن علیؑ اور ہاشمی افراد کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور تلاش حقیقت پر مجبور کر دیتا تھا۔

ساتواں باب

منازلِ غربت

وارث کعبہ نے کعبہ کو رخصت کیا، نتیجہ آخر امامؑ کے پیش نظر تھا یعنی موت جس پر حضرت کی وہ آخری تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکۂ معظمہ میں روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

خطّ الموت علی ولد آدم مخطّ القلادۃ علی جید الفتاۃ و
اولھنی الی اسلافی اشتیاق یعقوب الی یوسف وخیرلی مص
انا لاقیہ کانی انظر باوصالی تقطعھا عسلان الفلوات
بین النواویس وکربلا فیملان منی اکراشا جوفا وا
سغبا لا محیص عن یوم خطّ بالقلم رضا اللہ رضانا اھل
البیت نصبر علی بلائہ ویوفینا اجر الصابرین لن تشذ
عن رسول اللہ لحمتہ بل ھی مجموعۃ لہ فی حظیرۃ القدس
تقربھم عینہ وینجزبھم وعدہ من کان باذلا فینا
مھجتہ وموطنا علی لقاء اللہ نفسہ فلیرحل معنا
فانی راحل مصبحا انشاء اللہ۔

"موت فرزند آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف
کی ملاقات کا اشتیاق اُتنا ہی ہے جتنا یعقوبؑ کو یوسفؑ
سے ملنے کا تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں
میں کشتہ ہو کر گروں گا۔ گویا میری آنکھوں میں پھر رہا
ہے یہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درندے[1] جدا کر رہے
ہیں، مقام نواویس اور کربلا کے درمیان۔ وہ مجھ سے
اپنے خالی معدے اور گرسنہ شکم پُر کر رہے ہیں۔ کوئی
چارہ کار نہیں اُس دن سے جو خط تقدیر میں گذر چکا۔ خدا
کی مرضی میں ہم اہلبیتؑ کی مرضی ہے۔ ہم اُس کے امتحان پر

---

[1] یعنی دشمنانِ انسانیت

صبر کرتے ہیں اور صابرین کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔
رسولؐ سے اُن کے جسم کے ٹکڑے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ
وہ اُن کے لیے یکجا ہوں گے بارگاہ قدس میں کہ حضرت کی
آنکھیں خنک ہوں اور اُن کے ذریعہ سے حضرت کا وعدہ
پورا ہو۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ
اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو وہ ہمارے ساتھ سفر
کرے۔ میں کل صبح کو انشاءاللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

اس صورت حال کے بعد کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے
سامنے لانا کہ اس صورت میں جان کا خطرہ ہے تحصیل
حاصل اور فضول تھا۔

آپ کے پیش نظر موت کے ساتھ ساتھ یہ مقصد
بہت بڑا تھا کہ آپ کی طرف سے حجت تمام ہو اور
آپ کو موت آئے تو ایک انسانی فرض کی ادائی کے سلسلہ
میں جس کا نام ہے وعدہ وفائی، طالبین ہدایت کی ہدایت،
ایک اتنی بڑی جماعت (اہل کوفہ) کے التماس کی پذیرائی
اور امکانی ذرائع سے ظاہری حدود میں حفاظت خود اختیاری۔

اس کے خلاف جو بھی پہلو تھا وہ یہی کہ اہل کوفہ اپنے
مواعید پر عمل نہ کریں گے۔ اچھا نہ کریں گے لیکن حضرت تو
اپنے فرض سے ادا ہو جائیں گے اور الزام رہے گا تو اہل کوفہ پر۔

اسی لیے جس کسی نے آپ سے یہ کہا کہ اہل کوفہ وفا نہ کریں گے، آپ نے اُس کے خیال کی رد نہیں کی اور اہل کی طرف اپنے توقعات ظاہر نہیں فرمائے بلکہ زیادہ تصدیق کی مگر باوجود اس کے اپنی روانگی کو اُن کی طرف ضروری بتلایا، چنانچہ مکۂ معظمہ سے روانگی کے بعد سے پہلے منزل "صفاح" (بقول طبری) یا "ذات عرق" (بقول ابن طاؤس) پر فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہو گئی اور فرزدق نے کوفہ کی حالت حضرت سے یہ بیان کی کہ قلوب الناس معک وسیوفہم مع بنی امیۃ" لوگوں کے دل تو آپ ہی کی طرف ہیں مگر تلواریں اُن کی (جنگ کے موقع پر) بنی اُمیہ کے ساتھ ہوں گی۔"

حضرت نے فرمایا صدّقت "بیشک تم سچ کہتے ہو۔ لیکن للہ الامر واللہ یفعل ما یشاء وکل یوم ربنا فی شان ان نزل القضاء بما نحب فنحمد اللہ علے نعمائہ وہو المستعان علی اداء الشکر وان حال القضاء دون الرجاء فلم یعتد من کان الحق نیتہ والتقوی سریرتہ

"ہر بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھلاتا ہے۔ خدا کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہش کے مطابق ہو تو ہم

خدا کی حمد کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اُسی سے مدد طلب کریں گے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے سدِراہ ہو تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اُس کی نیّت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں صداقت اور پارسائی کا خیال باقی رہے۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ مقصد نیک ہو اور نیت خیر، اس کے بعد "ہرچہ بادا باد۔" اور اسی بلند ذہنیت کی روح تھی جو آپ کے ساتھیوں میں بھی دوڑی ہوئی تھی چنانچہ منزل ثعلبیہ پر پہونچ کر حضرت نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے انتم تسرعون والمنایا تسرع بکو الی الجنّۃ۔

"تم بڑی تیزی سے رات طے کر رہے ہو اور موت تمھیں تیزی سے جنّت کی طرف لے جا رہی ہے۔"

حضرتؑ کی آنکھ کھلی تو زبان پر تھا انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

شاہزادہ کونین حضرت علی اکبرؑ نے سبب پوچھا تو خواب بیان کیا۔ جس پر شاہزادہ نے عرض کیا السنا علی الحق "کیوں بابا ہم حق پر تو ہیں!" حضرت نے فرمایا "کیوں نہیں بیٹا۔ بے شک ہم حق پر ہیں"۔ شاہزادہ نے کہا اذاً فلا نبالی بالموت "پھر ہمیں موت کی کیا پروا۔"

کوفہ میں ہوا بدل چکی تھی۔ امامؑ مکہ معظمہ سے آٹھویں کو روانہ ہوئے اور نویں کو حضرت مسلمؑ کوفہ میں شہید ہو گئے۔ ابن زیاد نے اس اطلاع پر کہ حسینؑ بن علیؑ کوفہ کی طرف متوجہ ہیں کوفہ کے حدود پر ناکہ بندی کر دی ہے اور قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا کئی ہزار سواروں کے ساتھ حصین بن تمیم کو مقرر کیا گیا جو اب تک کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا تھا اور واقصہ سے لیکر قطقطانہ، لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام اور بصرہ کے راستے تھے اُن سب میں لشکر پھیلا دیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آسکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر امام حسینؑ کو ظاہری طور پر کوئی اطلاع نہیں، آپ جب وادی لطن رمّہ کے مقام "حاجر" میں پہونچے تو آپ نے اہل کوفہ کے نام حسب ذیل خط تحریر فرمایا:-

من الحسین بن علی الی اخوانہ من المؤمنین والمسلمین سلام علیکم فانی احمد الیکم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو اما بعد فان کتاب مسلم بن عقیل جاءنی یخبرنی فیہ بحسن رایکم واجتماع ملأکم علی نصرنا والطلب بحقنا فسألت اللہ ان یحسن لنا الصنع وان یثیبکم علی ذالک اعظم الاجر وقد شخصت الیکم من مکۃ یوم الثلثاء لثمان مضین

من ذی الحجة یوم الترویة فاذا قدم علیکم رسولی فاکمشوا امرکم وجدّوا فانّی قادم علیکم فی ایامی ھذہ انشاء اللہ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کا برادران ایمانی واسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمد وستائش باری کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیلؑ کے خط سے مجھ کو تمہارے حالات کی درستی اور اپنی نصرت پر تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام کو پہونچائے اور تم کو اس پر بہترین اجر عطا فرمائے، میں مکۂ معظمہ سے روز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں۔ جب میرا خط تمھیں پہونچے تو انتظامات کو مکمل کرو اور تیزی سے اپنا انتظام درست کرو کہ میں انہی چند روز میں تمہارے یہاں پہونچنے والا ہوں انشاء اللہ والسلام

یہ خط حضرت نے قیس بن مسہر صیداوی کو جو اہل کوفہ کے فرستادہ حضرت کے ساتھ تھے دے کر روانہ کیا جو قادسیہ میں پہونچ کر حصین بن تمیم کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے اور کوفہ پہونچ کر ابن زیاد کے حکم سے شہید کیے گئے۔

عبد اللہ بن یقطر جو آپ کے رضاعی بھائی تھے انھیں بھی راستے سے آپ نے مسلمؑ بن عقیل کے پاس روانہ کیا تھا۔ اور

وہ بھی اپنے پیش رو کی طرح منزل آخرت کی طرف رہ سپار ہوئے
اسی قرب و جوار میں ایک منزل پر زہیر بن قین نے حضرت
کی رفاقت اختیار کی اور روحانیت کی کشش نے ان کے دل میں
محبت کی رُوح اور شہادت کا شوق پیدا کیا۔ جو آخر تک انتہائی
ثبات و استقلال کے ساتھ قائم رہا اور نصرت امامؑ میں کربلا
کی زمین پر جرعۂ شہادت نوش کرنے پر ختم ہوا۔

کوفہ کے حالات قافلہ والوں سے پردۂ غیب میں تھے، امام
جو کچھ جانتے ہوں اُس سے مطلب نہیں۔ آپ کے ساتھیوں
کے توقعات عام طور سے بہت خوش آیند تھے۔ فرزند رسولؐ
کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ آپ اپنے باپ بھائی کے پایۂ تخت،
عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز (کوفہ) میں اپنے شیعوں
کے اصرار اور طلب پر جا رہے ہیں۔ وہاں پہونچ کر تاج و تخت،
فوج و لشکر، حشم و خدم سب کچھ مہیا ہوگا۔ حضرت بادشاہ
عراق ہوں گے اور امامت و سلطنت دوش بدوش آپ میں
مجتمع ہو گی۔ اس لیے دنیا کے لالچی۔ نکس صفت اشخاص بھی
جوق در جوق آپ کے ساتھ ہو رہے تھے اور راستے میں آپ کا
وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلتے وقت خاص لوگوں پر مشتمل تھا
اس لیے کہ آپ نے اپنی روانگی کے وقت وہاں جو خطبہ ارشاد
فرمایا تھا اور جس میں اپنے سفر کے آخری انجام کا اعلان کر دیا تھا،

اُس کے بعد آپ کے ساتھ روانہ ہونے والے وہی ہو سکتے تھے
جو فداکاری و جاں نثاری کا جذبہ اور حق کی راہ میں قربان
ہونے کا شوق رکھتے ہوں۔ چنانچہ اُن کا یہ جذبہ و شوق آخر
تک قائم رہا اور دفترِ شہادت کے سرخ ورق پر خونیں حرفوں میں
اُن کے نام درج کر گیا۔ وہ مختصر قافلہ اب ایک مختصر لشکر کی
صورت ہو گیا اور معلوم ہوتا تھا کہ بے شک کوئی بادشاہ ہے
جو اپنے مرکزِ سلطنت پر جا رہا ہے لیکن "زرود" کا مقام سب سے
پہلی منزل ہے۔ جہاں پریشانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کہ عبداللہ
بن سلیم اور منذر بن مشمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکۂ معظمہ
سے فراغتِ حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر اس منزل
پر حضرتؑ سے ملحق ہو گئے تھے ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے
آتے دیکھا جس نے حسینی قافلہ کو دیکھ کر راستہ بدل دیا اور
دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ امامؑ اُس کو دیکھتے ہی ٹھہرے
تھے کہ کچھ حالات کوفہ کے دریافت کریں لیکن جب یہ صورت
ہوئی تو حضرت آگے بڑھ گئے۔ اُن دونوں شخصوں نے آپس
میں مشورہ کیا کہ ہمیں اس سے کچھ کوفہ کی حالت دریافت کرنا
چاہیے۔ چنانچہ یہ دونوں آدمی قافلہ سے جُدا ہو کر انتہائی تیز
رفتاری سے جانے والے تک پہونچ گئے اور کہا السلام
علیک اُس نے جواب دیا وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ

انھوں نے پوچھا کہ تم کس قبیلہ کے آدمی ہو؟

اُس نے کہا اسدی، انھوں نے کہا ہم بھی بنی اسد میں سے ہیں، کچھ اپنے شہر کی حالت تو بیان کرو۔ اُس نے کہا نعم لم اخرج من الکوفة حتی قتل مسلم بن عقیل وھانی بن عروة فرأیتھما یجران بارجلھما فی السوق۔

"ہاں سنو۔ میں کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ قتل کیے گئے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُن کی لاش کے پاؤں میں ریسمان باندھ کر بازار میں کھینچا جا رہا ہے۔

دونوں آدمیوں نے سُن لیا اور موقع شناس تھے اس لیے دل میں رکھ لیا۔ جب حضرت منزل "زبالہ" پر پہونچے تو دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ حضرت نے جواب سلام دیا، انھوں نے عرض کیا انّ عندنا خبرا فان شئت حدثنا علانیة وان شئت سرا۔

"ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ اگر حضور کی اجازت ہو تو سب کے سامنے عرض کریں اور اگر ارشاد ہو تو علیحدہ۔"

حضرت نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص پر ڈالی اور فرمایا ما دون ھؤلاء ستر۔ "ان لوگوں سے کوئی پردہ نہیں۔"

اُنھوں نے عرض کیا ارایت الراکب الذی استقبلک

عشاءِ امس۔

"آپ نے اُس سوار کو ملاحظہ فرمایا تھا جو کل شام کے وقت آرہا تھا؟

حضرت نے فرمایا نعم وقد اردت مسائلتہ "ہاں اور میں نے اُس سے کچھ حالات بھی دریافت کرنا چاہے تھے"۔

اُنھوں نے کہا کہ "ہم نے حضور کے منشاء کے مطابق اُس سے حالات دریافت کیے اور وہ ہمارے ہی قبیلۂ بنی اسد کا آدمی ہے۔ بہت صاحب الرائے، صادق اللہجہ اور فاضل و دانشمند۔ اُس نے ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ دونوں شہید ہوگئے اور اُن کی لاشیں بازاروں میں پھرائی گئیں"۔

بلاشبہ یہ خبر بہت اندوہ ناک تھی، ایک طرف مسلم کا صدمہ جو آپ کے عزیز ترین بھائی اور وفادار ساتھی تھے۔ دوسری طرف اپنے مستقبل کے متعلق ظاہری تمام اُمیدوں کا خاتمہ ہونا لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت ہر موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی ہے۔

سخت موقعوں پر تمام لوگوں کی نظر سردار پر ہوتی ہے۔ اگر کہیں اُس کو اضطراب ہوا تو پھر تمام رفقاء اور ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔

تو اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسینؑ کو پہونچی کیا ہوا؟ بس اتنا کہ حضرت نے چند بار کہا انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون رحمۃ اللّٰہ علیہا یہی چند بار کہا اور خاموش ہو گئے۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشتناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اُس سے کافی متاثر ہو چکے تھے اور تمام نتائج پر غور کر چکے تھے کہ اب کیا ہو گا اور امامؑ کے کوفہ کی طرف جانے میں کیا توقع ہے اور اس صورت میں امامؑ کو اپنا خیال ترک کر دینا چاہیئے اور یہیں سے واپس ہو جانا چاہیے۔ اُن سے اپنے دل کی یہ بات دل میں نہ چھپائی گئی اور ایسے الفاظ سے کہ جن میں خود اضطراب کی جھلک نمایاں ہے اُنھوں نے عرض کی۔

ننشدك اللّٰہ فی نفسك واھل بیتك الّا انصرفت من مکانک ھذا فانّہ لیس لك بالکوفۃ ناصر ولا شیعۃ بل نتخوف ان تکون علیك۔

"خدا کا واسطہ اپنی اور اپنے اہل بیت کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے یہیں سے واپس ہو جائیے، کیونکہ کوفہ میں آپ کا کوئی مددگار ہے نہ کچھ شیعہ بلکہ ہمیں خوف ہے کہ کوفہ کے لوگ آپ کے خلاف ہوں گے۔"

یقیناً جذبۂ ہمدردی کا مشورہ جو وقتی تاثر و اضطراب

کا نتیجہ تھا، اُس کے مقابلہ میں یہ کوئی موقع نہ تھا کہ آپ فلسفیانہ و حکیمانہ مصالح اور عراق کے قصد کے باقی رکھنے کے وجوہ و اسباب اُن کو سمجھاتے اور اُن کے ذہن نشین کرتے، جب کہ وقتی جذبات کے مقابلہ میں اکثر عقلی دلائل کچھ کامیاب بھی نہیں ہوا کرتے بلکہ اُن کے لیے صبر و سکون کے لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری طرف یہ مشورہ اُن کا ایسا تھا جو یقیناً وقتی حیثیت سے تمام قافلہ والوں کے دل پر کارگر ہوتا اور اُس خوف و دہشت کی بنا پر جو ایک ایسے ہنگامی حادثہ سے پیدا ہو جانا چاہیے تھی سب کے دل میں یہی خیال جاگزیں ہوتا اور یہ اُن کے استقلال پر بہت بُرا اثر ڈالتا اس لیے یہ بھی مناسب نہ تھا کہ حضرت اُن کے اس مشورہ پر خاموش رہ کر اس خیال کو عام اہل قافلہ کے دل میں پرورش پانے کا موقع دیتے۔

لہٰذا حضرت نے یہ چاہا کہ وقتی جذبہ کا جواب ایک فطری جذبہ کے احساس سے دیا جائے اور اُس ہنگامی خیال کا ردعمل اُسی کے ساتھ ہو چنانچہ حضرت نے اس مشورہ کو سنتے ہی ایک نظر اولاد عقیل پر ڈالی اور فرمایا لماترون نقل قتل مسلم "کیوں تمہارا کیا خیال ہے مسلم تو شہید ہو گئے"؟ بس یہ سننا تھا کہ عقیلی جوان کھڑے ہو گئے اور کہا واللہ لا نبرح حتے ندرک ثارنا او نذوق ماذاق "خدا کی قسم ہم تو واپس ہونگے

جب تک اپنا انتقام نہ لے لیں یا وہی جرعہ ہم بھی نہ پئیں جو مسلم نے پیا
حضرت نے جو یہ سُنا تو رُخ کیا دونوں اسدیوں کی طرف اور
فرمایا لاخیر فی العیش بعد ھولاء۔
"جب یہ نہ ہوے تو ان کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔"
حاضرین میں سے بعض نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ انک واللہ
ماانت مثل مسلم بن عقیل ولو قدمت الکوفۃ لکان
الناس الیک اسرع۔
"آپ خدا کی قسم مسلمؑ کے مثل نہیں ہیں۔ آپ اگر کوفہ
پہونچ جائیں تو لوگ بہت تیزی سے آپ کی طرف متوجہ ہو جائینگے"
اس کے معنی یہ تھے کہ مسلمؑ کی شہادت سے مایوس نہ ہونا
چاہیے۔ آپ کے ورود کوفہ پر کوفہ میں انقلاب ہوگا اور ولولۂ نصرت
و جوشِ عمل کی روح دوڑ کر کامیابی کا باعث ہوگی۔
لیکن حضرت کی طرف سے اس خیال کی کوئی تائید نہیں ہوی
جس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت نے اس خیال خام کو
کسی وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا تو پھر حضرت کے اپنے ارا
پر سختی سے قائم رہنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے لیے ذرا صبر و
سکون سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔
حضرت کا روانگی عراق کا ارادہ اگر حقیقۃً آپ کی طرف
سے کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بے شک اب اُس ارادہ کو

بدل جانا چاہیئے تھا اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی کی صورت سے مبدل ہو چکے تھے۔ لیکن جب کہ حضرت کے سامنے کوئی امید کی جھلک نہ تھی جو دل کو لبھا رہی ہوتی بلکہ وہ اس حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب دعوت کی قبولیت تھی جس سے اتمام حجت کا مقصد پورا ہو رہا تھا تو اس ارادہ کو صرف اتنے پر کہ آپ کو حضرت مسلم کی خبر شہادت معلوم ہوئی متزلزل نہ ہونا چاہیئے تھا۔ بلکہ استقلال و ثبات قدم، کوہ آسا عزم اور پختگی ارادہ۔ وعدہ کی سچائی اور بات کی پابندی کا اقتضا یہ تھا کہ آپ انھیں دکھلا دیں کہ دیکھو ہم اپنے وعدہ پر قائم ہیں اور تمھارے بلائے ہوئے آتے ہیں اور اس وقت تک اپنے ارادہ پر قائم رہیں گے۔ جب تک روکے نہ جائیں اور جب تک ہمیں آگے بڑھنے میں خود اپنی طرف سے خوں ریزی اور امن و اماں کی بربادی کا اندیشہ نہ ہو۔

امام آخر واپس جاتے تو کہاں جاتے؟ مدینہ جاتے، حالانکہ وہیں سے ولید کی گفتگو کے بعد آئندہ خطرات کا اندازہ کرکے باہر آئے ہیں اور ان متوقع خطرات نے فعلی صورت اختیار کر لی اُس خط سے جو ولید نے یزید کو لکھا۔

الی عبد اللہ یزید امیر المومنین من ولید بن عتبۃ بن ابی سفیان فان الحسین بن علی لیس یری لک خلافۃ ولا

بیعتہ فرأیک فی امرہ۔

"خلیفۃ المسلمین یزید کی طرف ولید بن عقبہ کی جانب سے گذارش ہے کہ حسین بن علیؑ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں، اب آپ کی جو رائے ہو۔"

جس کے جواب میں یزید نے لکھا۔

اما بعد فاذا اتاک کتابی ھذا فعجل فی جوابہ وبیّن لی کل من اطاعنی اوخرج عنہا ولکن مع الجواب راس الحسین بن علی والسلام۔

"جب میرا خط پہونچے تو اس کا جواب جلد لکھنا اور یہ بھی لکھنا کہ کس نے میری اطاعت قبول کی اور کس نے میری اطاعت سے انحراف کیا لیکن بہر صورت جواب خط کے ساتھ حسین بن علیؑ کا سر موجود ہو۔"

وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیل حکم سے معذور رہا۔ اچھا تو پھر حضرت مکہ معظمہ واپس جاتے؟ حالانکہ وہاں گرفتاری کے آثار پاکر اور حرمت خانہ کعبہ کا خیال کر کے ہی حضرت باہر آئے ہیں اور وہاں کے متوقع خطرات بھی عملی طور پر اس وقت نمایاں ہوگئے جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پر حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے جو

یحییٰ بن سعید کی قیادت میں تھا۔ بیرون شہر آکر آپ سے مزاحمت کی، سدّ راہ ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ کو واپس چلنا ہو گا۔ حضرت نے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین کے لوگوں میں تھوڑی سی آویزش ہوئی جیسا کہ طبری کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ تدافع الفریقان فاضطربوا بالسیاط اور اُن کے بعد حضرت کے اصحاب نے استقلال کا مظاہرہ کیا اور اُن لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ (طبری ج ۶ ص۲۱۳) اس کے بعد حضرت کا مکہ واپس آنا کہاں تک قرینِ عقل ہو سکتا تھا؟

اور کسی طرف جانے کی کون سی صورت تھی۔ جب کہ وہاں سے آپ کے بیعت یزید سے انکار اور مدینہ سے ہجرت کرنے کے بعد کوئی تحریک بھی نہ ہوئی تھی۔ اس ناخواندگی کے عالم میں آپ کا وہاں جانا کون سی امید افزا صورت پیش کر سکتا تھا جب کہ وہاں جہاں سے سیکڑوں خطوط کے ساتھ طلب پیش کی گئی تھی یہ عالم نظر آرہا تھا۔

بہرحال آپ کے لیے پھر بھی متعیّنہ صورت یہی نظر آرہی ہے کہ جہاں سے بلائے گئے ہیں وہیں جائیں اور دیکھیں کہ صورت کیا پیش آتی ہے۔ پھر جب کہ ظاہری طور پر ابھی مسلم کی شہادت کے تفصیلات بھی معلوم نہیں ہوئے ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ وہ بہت خوں ریز لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جس میں اہل کوفہ

نے پورے طور پر داد شجاعت دی ہو اور حق اطاعت ووفاداری ادا کیا ہو لیکن سرکاری فوج کے مقابلہ میں سر برنہ ہوئے ہوں اور آپ کے پہونچنے پر اُن کو تازہ قوت حاصل ہو جائے اور ورنہ پلٹ کر حالت دگرگوں ہو جائے۔

اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جب کہ کوفہ کے بہت سے لوگ آپ ہی کے لیے بڑے مصائب میں مبتلا ہو چکے ہیں بہت زیادہ کمزوری قلب اور کمزوری ارادہ کا نمونہ سمجھا جا سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اگر آپ آگے بڑھے اور بلانے والوں کے بلانے پر جا کے وہاں تنہا رہ گئے اور شہید ہوئے جس کو آپ اپنے لیے پہلے ہی سے ناگزیر بتلا رہے ہیں اور اس شہادت کو قطعی طور پر اپنی نقل و حرکت کا مختتم نتیجہ سمجھتے ہیں تو آپ تو قطعی طور پر شہید ضرور ہو جائیں گے لیکن انسانی فطرت کے لازمی نتیجہ کے مطابق اہل کوفہ کے دل میں ایک احساس ضرور چھوڑ جائیں گے کہ ہائے ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی اور یہی احساس آگے بڑھ کے اور پرورش پا کے ایک عظیم طوفان کی صورت میں اُمڈے گا جو اموی سلطنت کے بیڑے کو غرق کر دے گا جس کے معنی ہوں گے آپ کی حقیقی فتح اور دشمن کی قطعی شکست۔

جیسا کہ بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ ادھر حسینؑ شہید ہو

اور اُدھر اہل کوفہ کے جذبات میں تلاطم ہوا اور یہ احساس پیدا ہوا کہ ہمارا بلایا ہوا مہمان تھا جو ہمارے تغافل یا تساہل کی بدولت مارڈالا گیا جیسا کہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ

لما قتل الحسین بن علی ورجع ابن زیاد من معسکرہ النخیلۃ فدخل الکوفۃ تلاقت الشیعہ بالتلاوم و التندم ورأت انہا قد اخطات خطأ کبیرا بدعائہم الحسین الی النصرۃ وترکہم اجابتہ وقتلہ الی جانبہم لم ینصروہ ورأوا انہ لا یغسل عارھم والاثم عنہم فی مقتلہ الا بقتل من قتلہ دالقتل فیہ۔

"جب حسینؑ بن علیؑ قتل ہو گئے اور ابن زیاد اپنے لشکر گاہ سے جو نخیلہ میں قرار دیا گیا تھا واپس جا کر کوفہ میں داخل ہوا تو شیعوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کر کے ایک دوسرے پر ملامت اور اپنی کمزوری پر ندامت کا اظہار شروع کیا اور وہ سمجھے کہ ہم سے بڑا جرم ہوا کہ ہم نے حسینؑ کو نصرت کے وعدہ پر دعوت دی پھر جب وہ آئے تو ہم اُن کی نصرت کو نہ گئے اور وہ ہمارے پڑوس میں قتل کر ڈالے گئے اور ہم نے کچھ اُن کی مدد نہ کی اور اُنھوں نے دیکھا کہ یہ عار و ننگ ہم سے دور نہیں ہو سکتا۔ مگر اس طرح کہ ہم اُن لوگوں کو جو اُن کے قتل میں شریک ہوئے ہیں قتل کریں یا خود اسی سلسلہ میں اپنی جانیں نثار کر دیں (طبری ج ۷ ص ۴۷)

اس کا نتیجہ تھا کہ سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر اجتماع ہوا اور اس موقع پر مسیب بن نجبہ نے جو تقریر کی ہے وہ یہ ہے کہ "ہم بہت اپنی صداقت پر ناز رکھتے تھے اور اپنی جماعت کی مدح وثنا کیا کرتے تھے لیکن خدا نے ہمارا امتحان لیا، اُس وقت معلوم ہوا کہ ہمارے دعوے غلط ہیں۔ ہم نے حسینؑ کو دعوت دی، اُن کے پاس پیغام بھیجے کہ آئیے ہم مدد کریں گے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے اپنی جانوں کو چھپایا، یہاں تک کہ وہ ہمارے پڑوس میں قتل ہو گئے۔ نہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے اُن کی نصرت کی اور نہ اپنی زبان سے اُن کی حمایت اور نہ اموال سے اُن کو تقویت پہونچائی اور نہ اپنے اپنے قبیلہ کو اُن کی نصرت پر آمادہ کیا۔ اب ہم خدا و رسولؐ کو کیا جواب دیں گے جب کہ ہمارے ملک میں فرزند رسولؐ کو قتل کر ڈالا گیا۔ بے شک ہمارا کوئی عذر سُننے کے قابل نہیں لیکن اب یہ موقع ہے کہ اُن کے قاتل کو اور جن لوگوں نے اُن کے قتل میں شرکت کی ہے اُن کو قتل کریں یا اسی سلسلہ میں اپنی جانیں نثار کر دیں۔"

(طبری جلد ۷ صفحہ ۴۸)

اس کے بعد جب کہ سلیمان بن صرد اس جماعت کے قائد اعظم کی حیثیت سے منتخب ہو گئے تو اُنھوں نے جو تقریر کی ہے اور جس کو وہ برابر ہر جمعہ میں دُہرایا کرتے تھے اس کا مختصر اقتباس

یہ ہے کہ

انا کنا نمدّ اعناقنا الی قدوم آل نبیّنا ونمنیهم النصر ونحثّهم علی القدوم فلما قدموا ونینا وعجزنا وادهنّا وتربّصنا وانتظرنا ما یکون حتیٰ قتل فینا ولد نبیّنا وسلالته وعصارته وبضعة من لحمه ودمه اذ جعل یستصرخ ویسأل النصف فلا یعطاه اتخذه الفاسقون غرضا للنّبل ودریّة للرّماح حتیٰ اقصدوه۔

"ہم لوگ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اشتیاق کے ساتھ اہلبیت رسولؐ کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور اُن کو نصرت کی اُمیدیں دلاتے تھے اور آنے پر آمادہ کرتے تھے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے کمزوری کی اور عاجز رہے اور سستی کو کام میں لائے اور منتظر رہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے یہاں تک کہ ہمارے ملک میں اور ہمارے قریب ہی فرزند رسولؐ قتل کر ڈالے گئے جب کہ وہ فریاد کر رہے تھے لیکن کوئی انصاف سے کام نہ لیتا تھا۔ فاسقین کی جماعت نے اُن کو اپنے تیروں کا نشانہ اور نیزوں کا سرمشق بنا لیا یہاں تک کہ اُنھیں شہید کر ڈالا (ص ۴۹) جماعت توابین کا جہاد اسی جذبہ کے ماتحت تھا اور پھر مختار بن ابو عبیدہ کا اقدام عمل، قاتلین سید الشہداؑ کا استیصال اور ابن زیاد کا خاتمہ اسی کا نتیجہ۔

حسینؑ تو جہاں جاتے شہید کیے جاتے لیکن یہ بات نہ ہوتی جو کوفہ کی طرف آنے میں ہوئی۔ اُس وقت حضرت کی شہادت شاید شکست قرار پاتی اور اب فتح ہے اور دائمی فتح۔

یہی عظیم سیاست ہے امام حسینؑ کی جو شروع سے آخر تک حضرت کے ہر طرزِ عمل میں کارفرما ہے لیکن افسوس ہے کہ دنیا غور نہیں کرتی اور اعتراض کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

حضرت نے مسلمؑ کی شہادت سُننے کے بعد بھی اپنے ارادہ کو مضبوطی سے قائم رکھا اور اپنے آخری انجام کی ذمہ داری اہل کوفہ پر باقی رکھی جیسا کہ حضرت کی گفتگو سے جو طرمّاح ابن عدی کے ساتھ ہوئی ہے ظاہر ہے۔ جب طرمّاح نے عرض کیا ہے کہ آپ میرے ساتھ کوہ اجار پر چلیے جو بلا دطے میں ہے اور میں آپ کی امداد کے لیے وہاں فوج جمع کروں گا تو حضرت نے فرمایا۔

جزاک اللہ و قومک خیرا انہ قد کان بیننا و بین ھؤلاء القوم قول بسنا نقدر معہ علی الانصراف ولا ندری علی ما تنصرف بنا و بھم الامور فی عاقبۃ۔

"میں ان لوگوں کو قول دے چکا ہوں جس کی بنا پر پلٹ نہیں سکتا۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ انجام کار میں ہمارے اور

اُن کے درمیان کیا صورت پیش آئے گی۔" (طبری ج ۶ ص ۲۳۱)
بے شک چونکہ راستے کے قبائل اور بے تعلق اشخاص میں بہت سے لوگ جیسا کہ ہم سابق میں لکھ چکے ہیں مکہ سے روانگی کے بعد آپ کے ساتھ ہو گئے تھے جو طرح طرح کے خوشگوار توقعات کو اپنے دل میں جگہ دیے ہوئے تھے اس لیے حضرت کو یہ منظور نہ ہوا کہ اب جب کہ ظاہری اسباب کی بنار پر بھی وہ توقعات ختم ہو چکے ہیں تو اب زیادہ دیر تک اُن لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھا جائے۔

قرائن بتلاتے ہیں کہ وہ لوگ جن کی موجودگی میں حضرت مسلمؑ کی خبر شہادت بیان کی گئی تھی وہ حقیقۃً جیسا کہ آپ نے اُن لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر فرمایا تھا کہ مادون ھؤلاء سر" ان لوگوں سے کوئی راز پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بے شک مخصوص لوگ تھے جن کی امانت و رازداری پر آپ کو کامل اعتماد تھا اس لیے اتنے مجمع میں حضرت مسلمؑ کی خبر شہادت ظاہر ہونے کے بعد پھر بھی عام اہل قافلہ سے راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی یہاں تک کہ حضرت کو عبداللہ بن یقطر کی خبر شہادت بھی پہونچی جنھیں آپ نے کوفہ کی طرف روانہ کیا تھا اور وہ حصین کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر کوفہ میں شہید کیے گئے۔

حضرت نے اب ان واقعات کو اہل قافلہ سے مخفی رکھنا صداقت کے خلاف سمجھا، اس لیے ایک سرکاری بیان کی حیثیت سے حسب ذیل تحریر اہل قافلہ کو جمع کر کے انھیں سُنائی:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اما بعد فقد اتانا خبر فظیع قتل مسلم بن عقیل وھانی بن عروۃ وعبد اللہ بن یقطر وقد خذ لتنا شیعتنا فمن احبّ منکم الانصراف فلینصرف لیس علیہ منّا ذمام۔

"معلوم ہو کہ ہم کو دردناک خبر پہونچی ہے کہ مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ رض قتل کر ڈالے گئے اور ہمارے شیعوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ تو جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس جائے۔ ہماری طرف سے اُن پر کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔

بس یہ اعلان ہونا تھا کہ لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور دائیں بائیں منتشر ہو گئے یہاں تک کہ بس وہی لوگ جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے۔

مورخ طبری کا بیان ہے:۔ وانما فعل ذلک لانہ ظنّ انما اتبعہ الاعراب لانّھم ظنّوا انّہ یاتی بلدا قد استقامت لہ طاعۃ اھلہ فکرہ ان یسیروا معہ الاّ وھم یعلمون علٰے ما یقدمون وقد علم انّھم اذا بین لھم لم یصحبہ الامن یرید مواساتہ والموت معہ۔

"حضرت نے یہ اس لیے کیا کہ آپ کا خیال تھا کہ صحرانشین عرب آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں یہ سمجھ کر کہ آپ ایک ایسے ملک میں جا رہے ہیں جہاں لوگ پورے طور پر آپ کی سلطنت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ حضرت کو یہ ناپسند معلوم ہوا کہ وہ لوگ آپ کے ساتھ رہیں جب تک حقیقت حال سے واقف نہ ہو جائیں اور آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورتِ حال کا اظہار کر دیں گے تو آپ کے ساتھ بس وہی لوگ رہ جائیں گے جو حقیقۃً آپ کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کے ساتھ مرنا پسند کرتے ہیں۔" (طبری ج ۶ ص ۲۲۶)

اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت کا اقدام کسی ناسمجھی پر مبنی تھا یا آپ کو جاہ دنیا کی ہوس تھی؟ ہرگز نہیں۔ آپ کا طرز عمل بتلا رہا ہے کہ آپ ایک باعزّت موت کا مقصد پیش نظر رکھے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن موت ایسی جو نتیجہ خیز ہو اور لاحاصل نہ قرار پا سکے۔ آپ نے صداقت اور عام اہل دُنیا سے بے نیازی کا وہ اعلیٰ نمونہ ظاہر کیا جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔

شب بسر ہوی اور صبح ہوی۔ امامؑ نے حکم دیا کہ پانی کثرت سے بھر لو اور مشکیں، چھاگلیں پانی سے پُر کر لو، جاں نثار رفقاء نے اطاعت کی اور قافلہ آگے روانہ ہوا۔

آٹھواں باب

اِرادہ میں تبدیلی

اور

کربلا میں وُرُود

امامؑ اپنے ارادہ پر قائم ہیں۔ کوفہ کی طرف متوجہ ہیں اور کوفہ کا رُخ ہے۔ ہجرت کا سنہ ساٹھ اپنے دور کو ختم کر کے رخصت ہوا ہے اور محرم سنہ اکسٹھ ہجری کا چاند فلک پر نمودار ہو گیا۔

پہلی تاریخ بھی ہو گئی اور دوپہر دن کے قریب گذر رہا ہو گا کہ حسینؑ کا قافلہ منزل شراف کے حدود سے آگے بڑھا ہے۔ ایک شخص نے اصحاب میں سے کہا "اللہ اکبر" حضرت نے فرمایا۔ بے شک "اللہ اکبر" مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اُس نے کہا "مجھے خرمے کے درخت دکھلائی دے رہے ہیں"۔

(اس کے معنی یہ ہیں کہ کوفہ قریب آگیا) دو نوں اسدیوں نے (جن کا تذکرہ خبر شہادت مسلمؑ کے سلسلہ میں آچکا ہے) جو راستے

واقف تھے کہا کہ اس جگہ تو درخت خرما کبھی ہم نے دیکھے نہیں۔" حضرت نے فرمایا پھر تم دیکھو تمھیں کیا معلوم ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا ہمیں تو گھوڑوں کی گردنیں نظر آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں۔ اچھا یہاں کوئی ایسی پشت پناہ ہے جس کو ہم اپنی پس پشت قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مڈبھیڑ کریں؟ لوگوں نے کہا۔

"یہ ذو حسم پہاڑ موجود ہے جو آپ کے بائیں پہلو کی طرف واقع ہے آپ اس کی طرف متوجہ ہو جیے، اگر دشمن کے پہلے ہم اُس پہاڑ تک پہونچنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ کا مقصود حاصل ہو جائے گا۔

حضرت نے بھی اس رائے کو پسند فرمایا اور آپ بائیں طرف متوجہ ہو گئے۔ آنے والی سپاہ نے جو یہ دیکھا تو اُس نے بھی اُسی طرف کا رُخ کیا۔

حضرت اُس مقام تک پہلے پہونچ گئے تھے، اصحاب کو حکم دیا کہ خیمے نصب کر دیے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اتنی دیر میں وہ آنے والی فوج قریب پہونچی اور معلوم ہوا کہ حر بن یزید ریاحی ہے ایک ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ جنھیں حصین بن تمیم افسر افواج قادسیہ نے آپکے سدِّ راہ ہونے کے لیے بھیجا ہے۔

وقت دوپہر کا تھا اور حضرت کی توجہ ذی حسم کی طرف منعطف

ہونے کے بعد مخالف لشکر کو پوری تگ و دو کرنا پڑی تھی کردہ آپ کے قبل ذو حسم تک پہونچ جائے جس کی وجہ سے پیاس کا بہت غلبہ ہو گیا تھا۔

امامؑ اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے، تلواریں حمائل کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار آپ کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ آثار و قرائن پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور پانی کے دستیاب نہ ہونے سے سب کی حالت تباہ۔ حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور جذبۂ ایثار و مواسات اُس کا جوہر خاص۔ حضرت کے لیے دشمن کی بھی موجودہ حالت برداشت کے قابل نہیں تھی۔

حریف کی سپاہ مگر اس حالت میں تھی۔ حسینؑ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا اسقوا القوم وادووھم من الماء ورشفوا الخیل ترشیفا "پانی پلاؤ اور انھیں سیراب کردو اور گھوڑوں کو بھی پورے طور سے سیراب کرو"

حکم کی دیر تھی۔ اطاعت امامؑ پر کمربستہ جوان آمادہ ہو گئے اور سب کو سیراب کیا۔ حالت یہ تھی کہ اقبلوا یملأون القصاع والاتوار والطساس من الماء ثم ید نونھا من الفرس فاذا عب فیہ ثلثا اواربعًا او خمسًا عزلت عنہ وسقوا

اخرحتی سقوا الخیل کلھا۔

"پیالے، لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور اُسے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے۔ جب وہ تین چار پانچ دفعہ پی کر منھ اپنا ہٹا لیتا تھا تو اُس وقت دوسرے کے پاس لے جاتے تھے یہاں تک کہ سب سیراب ہوگئے۔ علی بن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں حر بن یزید کے ساتھ تھا لیکن سب سے آخر میں وہاں پہونچا۔ جب حضرت نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا فرمایا انخ الراویۃ۔" راویہ یعنی شتر آب کش کو بٹھالو"! میری زبان میں" راویہ" مشک کو کہتے تھے اس لیے میں نہ سمجھا کہ مشک کو بٹھانے کے کیا معنی۔ حضرت نے فرمایا انخ الجمل یعنی اونٹ کو بٹھالو۔ میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا پیو۔ اب پانی پیو۔ میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا تھا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہونچتا تھا۔ حضرت نے فرمایا۔ اخنث السقاء یعنی مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو" مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر حضرت خود اُٹھے اور مشک کے دہانے کو درست کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود پیا اور اپنے گھوڑے کو بھی سیراب کیا (طبری ج ۶ ص ۲۲۶)

یہ تھا حسینؑ کا کرم۔ یہ تھے حسینؑ کے اخلاق۔ یہ تھی حسینؑ کی بلند حوصلگی اور کشادہ دلی۔ یہ تھی حسینؑ کی انسانی ہمدردی اور احساسات

یہ تھی حسینؑ کی بلند نظری اور شرافت طبعی۔

یہ تھی حسینؑ کی اخلاقی جنگ جس سے آپ نے دشمن پر پہلے ہی فتح حاصل کی اور اُسے اپنا قیدی بنایا۔ جس کا نتیجہ کم و بیش صورت میں ظاہر ہوا۔ نتیجہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

حُر کا ورود اچانک صورت پر امامؑ اور اصحاب امامؑ کے لیے تشویش ناک ضرور تھا لیکن حضرت کا استقلال اُس تشویش کو نمایاں ہونے دے، ناممکن۔ حضرت کا منزل ذو حسم پر آکر پہلے فروکش ہونا اور پھر اُس بڑے لشکر کا وہاں پہونچنا حضرت کی جانب سے اُن کے ساتھ موافقت کا طرز عمل اختیار کیا گیا کہ اُن کو سخت وقت پر پانی سے سیراب کرایا۔ گویا آپ میزبان بن گئے اور وہ میہمان۔ اس لیے حضرت نے ابھی اُن سے کسی قسم کی گفتگو نہیں کی کہ تم کس لیے آئے ہو۔ اور وہ حضرت کے اس طرز عمل سے ششدر سے رہ گئے ہیں۔ اس لیے انھیں کچھ مخالفانہ بات چیت کرتے نہیں بنتی۔

یوں ہی دونوں طرف کے لشکروں پر ایک خاموشی کا عالم چھایا ہے، یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور حضرت نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور اُنھوں نے اذان کہی۔ جب صفیں جماعت کی تیار ہوگئیں حضرت اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے۔ اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد

ارشاد فرمایا۔

ایھا الناس انھا معذرۃ الی اللہ عز وجل والیکم انی لم اتکم حتی اتتنی کتبکم وقدمت علیّ رسلکم ان اقدم علینا فانہ لیس علینا امام لعل اللہ ان یجمعنا بک علی الھدی فان کنتم علی ذلک فقد جئتکم فان تعطونی ما اطمئن الیہ من عھودکم ومواثیقکم اقدم مصرکم وان لم تفعلوا وکنتم لمقدمی کارھین انصرفت عنکم الی المکان الذی اقبلت منہ الیکم۔

"اے (کوفہ کے) لوگو میں خدا کی بارگاہ میں اور تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں اُس وقت تک تمہاری طرف نہیں آیا، جب تک کہ تمہارے خطوط میرے پاس نہیں گئے اور تمہارے قاصد نہیں پہونچے کہ آپ ہماری طرف آیئے۔ ہمارا کوئی امام نہیں۔ شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کردے۔ اب اگر تم اُسی بات پر قائم ہو تو خیر میں آیا تو ہوں ہی۔ اگر تم مجھے عہد و پیمان کے ساتھ اطمینان دلادو تو میں تمہارے شہر میں وارد ہوں اور اگر تم میرے آنے سے ناراضمند ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں"۔

حضرت نے یہ تقریر فرمائی اور کوئی جواب نہیں ملا۔

حر کہ جو آزاد تھا وہ حضرت کے قید احسان کا غلام ہو چکا تھا
اس لیے اُس کی زبان خاموش تھی اور کچھ کہتے نہ بن پڑتا تھا۔
آخر حضرت نے اقامت کا حکم دیا اور موذن نے اقامت کہی
حضرت نے حر سے فرمایا کہ تم اپنے ساتھیوں کو علیحدہ نماز
پڑھاؤ گے؟ حر نے عرض کیا نہیں بلکہ آپ نماز پڑھایئے اور
ہم سب آپ ہی کی اقتدا میں نماز پڑھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا
اور دونوں طرف کے لشکروں نے امام کے پیچھے نماز ادا کی
ظہر کے بعد حضرت اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپ کے
اصحاب آپ کے خیمہ میں مجتمع ہوئے، حر بھی اس خیمہ میں جو اُس
کے لیے لگا دیا گیا تھا داخل ہوا اور وہاں اُس کے کچھ ساتھی
اُس کے پاس آکر بیٹھے اور دوسرے لوگ اپنی اپنی جگہ پر واپس
ہوئے اس طرح کہ ہر ایک نے اپنے گھوڑے کی لگام ہاتھ
میں لی اور اُسی کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ عصر کا وقت ہوا تو حضرت
نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر حضرت
نے باہر آکر عصر کی نماز کا اعلان کرایا اور نماز عصر کے بعد حضرت
نے رخ کیا اُس تمام جمعیت کی طرف اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد
فرمایا:

ایھا الناس فانکم ان تتقوا وتعرفوا الحق لاھلہ
یکن ارضی للہ ونحن اھل البیت اولی بولایۃ ھذا الامر

علیکم من ھؤلاء المدعین ما لیس لھم والسائرین فیکم بالجور والعدوان وان انتم کرھتمونا وجھلتم حقنا وکان رایکم غیر ما اتتنی کتبکم وقدمت بہ علیّ رسلکم انصرفت عنکم۔

"تم لوگ اگر تقویٰ اختیار کرو اور حق کو اُس کے حقدار کے واسطے جانو اور پہچانو تو یہ خدا کی رضامندی کا باعث ہوگا۔ حقیقۃً ہم اہلبیت اس امر خلافت کے زیادہ مستحق ہیں اُن لوگوں سے جو خلاف واقعہ دعاوی کرتے اور تم مسلمانوں کے اندر جور و ظلم کی رفتار چلتے ہیں۔ اور اگر تم ہم کو ناپسند کرتے اور ہمارے حق سے ناواقف اور اُس رائے کے خلاف ہو جو تمہارے خطوط سے اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہوتی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

اب حر کی مہرِ خاموشی ٹوٹی اور اُس نے کہا واللہ ما ندری ما ھذہ الکتب التی تذکر۔

"ہمیں تو خدا کی قسم خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں جن کا آپ ذکر فرماتے ہیں۔"

حضرت نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا "لاؤ وہ خطوط تو لاؤ، جو ان لوگوں کے روانہ کیے ہوئے خورجینوں میں بھرے ہوئے ہیں۔" عقبہ نے دو خورجینیں خطوط سے بھری ہوئی سامنے پیش کیں اور

وہ خطوط نکال کر سامنے پھیلا دیے۔ حر نے کہا:

انا لسنا من ھؤلاء الذین کتبوا الیک وقد امرنا اذا نحن لقیناک ان لا نفارقک حتیٰ نقدمک علیٰ عبید اللہ بن زیاد۔

"ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے آپ کے نام خطوط تحریر کیے تھے۔ ہمیں تو یہ حکم ہوا ہے کہ جہاں آپ سے ملاقات ہو جائے، بس آپ سے جدا نہ ہوں یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے سامنے لے جائیں۔"

حضرت نے فرمایا الموت ادنیٰ الیک من ذلک۔

"لاحول ولا قوۃ۔ موت بہ نسبت اس مقصد کے تم سے زیادہ نزدیک ہو گی۔"

بس اب امامؑ کا ارادہ بدل گیا ہے اور مقصد مختلف۔ اب صورت یہ ہے کہ کوفہ پر ابن زیاد کی گرفت مضبوط اور وہاں جنگ کا سامان مکمل ہے اور کوفہ اس وقت ایک پورے طور پر جنگ کا قلعہ بنا دیا گیا ہے۔

راستے کے حدود پر ابن زیاد کی فوج کا پہرہ ہے۔ اور تمام حدود سپاہیوں سے مملو۔ قادسیہ میں حصین بن تمیم کا مرکز ہے اور وہ اسی مقصد کے لیے متعین۔ حر کا رسالہ اسی لیے آگے بڑھا ہے کہ وہ آپ کو گھیر کر ابن زیاد کے قابو میں لے جائے۔ اس صورت میں آپ کا کوفہ ہی کی طرف توجہ کو قائم رکھنا دو ہی صورتیں رکھتا

ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایانہ صورت سے فوجوں کو درہم و برہم کرتے۔ راستے کو صاف کرتے، کوفہ پر حملہ آور ہوں اور ابن زیاد کو کوفہ سے نکال کر کوفہ کو فتح کریں اور اپنی حکومت قائم کریں۔

دوسرے یہ کہ آپ صبر و خاموشی کے ساتھ آگے بڑھیں اور جس طرح سے اب تک آ رہے ہیں۔ اُسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار سفر کو جاری رکھیں۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن ہے۔ آپ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھیں، یہ بڑھنا آسان ہے لیکن اب تک آپ کا آگے بڑھنا خود مختارانہ حیثیت سے اور اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ تھا اور اب حر کی فوج آ جانے کے بعد اس مقصد سے کہ آپ کو کوفہ ابن زیاد کے پاس لے جائے آپ کا خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنا ابن زیاد کی فوج کے ہاتھ اسیر ہو جانا اور ابن زیاد کا قیدی بن جانا ہے۔ اس لیے کہ ابھی یہ حر کی سپاہ ہے اور آگے بڑھ کر حصین کا فوجی مرکز ہے اور وہاں سے پھر افواج کے محاصرہ میں ابن زیاد کے پاس لے جایا جاتا ہے جس کے بعد آپ کا معاملہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے۔ اور ایک طرف آپ کے نصب العین اور حقیقی مقصد کے خلاف ہے۔ دوسری طرف اس میں آپ کی جان کا معرض تلف میں آنا اور آپ کا آخر میں قتل کیا جانا

یقینی ہے اور وہ قتل کیا جانا ایک عاجزانہ و کم ہمتانہ قتل ہے جس کے بعد آپ کے واقعۂ شہادت کا وہ وزن نہیں ہو سکتا جو اُس طرح سے قتل ہونے کا جو آج "مجاہدۂ کربلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مظلومی سے قتل ہونا اور چیز ہے اور ذلت آمیز عاجزانہ قتل دوسری چیز، حسینؑ مظلوم بننا چاہتے تھے۔ لیکن عاجز اور کم ہمت، بُزدل وغیرہ بنائے جانے کے لیے تیار نہ تھے۔

اور اس لیے آپ نے حر کے اس اظہار کا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے چلنے کے لیے آئے ہیں انتہائی ترش اور دلیرانہ جواب یہ دیا کہ الموت ادنیٰ الیک من ذالک "موت تمھیں اس سے نزدیک تر معلوم ہوگی"۔

بے شک پہلی صورت باقی ہے کہ آپ کوفہ کی طرف جائیں تو لیکن اُس طرح نہیں جیسا حر کی فوج والے کہتے ہیں کہ آپ اُن کے لے جائے ہوئے جائیں بلکہ آپ کوفہ کی طرف حملہ آورانہ صورت سے جائیں اور غنیم کی فوج کو پسپا کر کے وہاں اپنا قبضہ قائم کریں۔

یہ صورت بے شک پہلی صورت سے مختلف ہے لیکن اس میں علاوہ اس کے کہ آپ کی موجودہ فوجی طاقت ایسی نہیں ہے کہ ایک تیار شدہ فوجی نظام حکومت کا مقابلہ کر سکے کیونکہ ایک جگہ گھیر لیے جانے کے بعد مدافعت و حفاظت خود اختیاری کے اصول پر بہتّر سے تیس ہزار کا مقابلہ کر لینا صحیح و حق بجانب

ور ہمت و شجاعت کا بہترین مظاہرہ ہے لیکن اس قلیل
عداد کے ساتھ غنیم کے مقابلہ میں جارحانہ حملہ کرنا تہوّر اور
عاقبت اندیشی ہے جو کوئی ممدوح صفت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ سب سے زیادہ جو نمایاں پہلو ہے وہ
یہ آپ کے اُس مسلک کے خلاف ہے جو شروع سے آپ نے
قائم رکھا ہے کہ آپ کی طرف سے بغاوت کی صورت نہ ہو
ور شورش پیدا نہ ہو۔ آپ ملک کے امن و اماں کو تباہ کرنے
والے اور خوں ریزی کے ذمہ دار قرار نہ پائیں۔

کوفہ پر آپ کا حملہ آور ہونا یہ آپ کی طرف سے ایک عملی
جنگ کا قدم تھا جسے اُٹھانا آپ کی رواداری اور امن پسندی
کے خلاف تھا۔

اُس صورت میں وہ لوگ ذرا بلند آہنگ کے ساتھ آواز
اٹھا سکتے تھے جو آپ کے طرز عمل کو ایک بغاوت و شورش
سے تعبیر کرتے ہیں اور آپ کو ملک کے امن و اماں کو تباہ
کرنے کا ذمہ دار قرار دینا چاہتے تھے۔

رسول اسلامؐ کا فرزند اپنے اوپر اس الزام کے لینے پر
تیار نہ تھا۔ وہ مظلوم بننا چاہتا تھا۔ جارح نہیں۔ وہ رواداری
کے حدود سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتا تھا امامؑ نے پہلی ہی گفتگو میں
جو حر سے کی اس رواداری جذبہ کا مظاہرہ فرما دیا تھا یہ کہہ کر

کر میں بُلایا ہوا آیا تھا۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو میں واپس جاتا ہوں۔

بس یہی بات تھی جو اُس صورت میں نہ ہوتی اگر آپ خود کوفہ پر حملہ فرما دیتے یا حر اور اس کی فوج سے جنگ شروع کر دیتے جس پر آپ کے بعض اصحاب مصر بھی تھے مگر حضرت نے یہی فرمایا کہ ہم جنگ کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے۔

بس یہی سبب تھا کہ اب فوج حر کی اس مزاحمت کے بعد حضرت نے کوفہ کا خیال ترک فرما دیا ہے اور آپ واپس جانا چاہتے ہیں۔ کہاں؟ مدینہ میں یا مکہ۔ یا اُن اطراف میں کہیں اور؟ یہ معلوم نہیں۔

اور اسی خیال سے حضرت نے مذکورۂ بالا مکالمہ کے بعد جو حر سے ہوا، اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو جاؤ۔ چنانچہ سب لوگ یہاں تک کہ مخدرات بھی اپنی عماریوں میں سوار ہوئے۔ حضرت نے اصحاب سے فرمایا کہ چلو جس راستے سے آئے ہیں، اُسی راستے پر چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حر کی سپاہ سامنے آکر سد راہ ہوئی اور اُس طرف جانے سے مزاحمت کی۔

یہ ایک عملی قدم تھا جو آپ کے خلاف حر کی سپاہ نے اُٹھا دیا اور حضرت نے اس کو برداشت نہ کرتے ہوئے حر سے بہت ترش و

تلخ انداز میں فرمایا کہ تمہارا مطلب کیا ہے؟ حُر نے کہا اریدو اللہ ان انطلق بک الیٰ عبید اللہ بن زیاد۔

"بخدا میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں"۔

حضرت نے فرمایا اذن واللہ لا اتبعک "اس صورت میں خدا کی قسم تمہارا کہنا نہیں مانوں گا"۔

حر نے کہا اذن واللہ لا ادعک "تو میں آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں"۔

یوں ہی تین مرتبہ آپ میں اور حر میں رد و بدل ہوئی۔ آخر میں حر نے کہا میں آپ سے جنگ کرنے پر تو مامور نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ حکم تھا کہ آپ کے ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کوفہ پہونچیں۔ اب جب آپ کوفہ جانے سے انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا راستا اختیار کیجیے جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف واپسی کا راستا ہو۔ وہ میرے اور آپ کے درمیان انصاف کا ذریعہ ہو۔ آپ اُس راستے پر چلیے تاکہ میں ابن زیاد کو لکھوں اور آپ اگر چاہیں یزید کو خط لکھیں اور چاہیں ابن زیاد کو۔ بہر حال شاید خدا اس طرح ایسی صورت پیدا کر دے کہ مجھے آپ کی کوئی عملی مخالفت نہ کرنا پڑے۔

حضرت کو حر کے اُس مطالبہ کا مسترد کرنا پھر اپنے تمام

اصولوں کو دیکھتے ہوئے نامناسب معلوم ہوا۔ یعنی موجودہ صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ حجاز کی طرف جانے والے راستے کے اختیار کرنے پر مصر رہتے ہیں جنگ یقینی ہے اور پھر آپ کو جیسا کہ ہم سابق میں لکھ چکے ہیں حجاز میں کوئی ایسی جگہ نظر بھی نہیں آتی۔ جہاں آپ تشریف لے جائیں۔

ایسے راستے کے اختیار کرنے میں جسے حر کہتا ہے کوئی ویسا فعلی خطرہ نہیں ہے جیسا کوفہ کی طرف بڑھنے میں اور پھر اس راستے کے اختیار کرنے میں یہ بھی ہے کہ کوفہ میں شاید خبر پہونچے آپ کے ورود کی اور وہاں کے لوگوں میں کوئی جوش پیدا ہو آپ کی نصرت کا یا کسی اور طرف حضرت کو کوئی پناہ کی جگہ ملے جسے آپ اپنا مستقل مرکز قرار دیں اس لیے کہ اس طرف مدائن بھی ہے جو ایران کا پایۂ تخت ہے اور وہاں سے ایران کا اتصال ظاہر ہے اور ایران میں حضرت امام حسینؑ کے لیے مناسب فضا کا ہونا اُس رابطہ سے جو حضرت شہر بانو کی وجہ سے پیدا ہو چکا ہے کوئی خلاف توقع بھی نہیں۔

بہر حال یہ سب ظاہری پہلو ہیں جن پر انسان کے وقتی افعال کی بنیاد قائم ہی ہوا کرتی ہے ورنہ اصلی نتیجہ تو معلوم ہے اور بہت پہلے سے معلوم کہ وہ قتل ہونا ہے اور کچھ نہیں۔

ان تمام امور کو دیکھتے ہوئے حضرت کو حر کی اس بات پر

عمل کرنا مناسب معلوم ہوا اور حضرت کی رواداری نے اُس کے اس قول کی پذیرائی پر آپ کو مجبور کیا۔ چنانچہ آپ قادسیہ وعذیب کے راستے سے بائیں رُخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور حر حضرت کے ساتھ ساتھ۔

راستے میں جو گفتگو حُر اور حضرت کے درمیان ہوی ہے وہ بڑی معنی خیز ہے۔

حر کہہ رہا تھا۔ انی اذکرك اللّٰہ فی نفسك فانی اشھد لئن قاتلت لتقتلن ولئن قوتلت لتھلکن فیما اری۔

"دیکھیے میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ آپ اپنی زندگی پر رحم کیجیے اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً آپ قتل ہوں گے اور ہلاک کیے جائیں گے۔

حضرت نے فرمایا افبالموت تخوفنی وھل یعد وبکم الخطب ان تقتلونی "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو۔ اور کیا تم لوگ اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر دو"۔

اس کے بعد حضرت نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا قول بطور مثال پڑھا۔

سامضی وما بالموت عار علی الفتی اذا ما نوی حقا وجاھد مسلما

"میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت میں ایک جواں مرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جب کہ اُس کی

نیت میں سچائی ہو اور دین حق پر بر قرار رہتے ہوئے جہاد کر رہا ہو۔"

جب حر نے یہ سُنا کہ حضرت موت پر تیار ہو چکے ہیں تو وہ حضرت سے تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ ہو گیا اور دور دور مگر حضرت ہی کے ساتھ روانہ ہوا۔

قافلہ راستا قطع کر رہا ہے اور امامؑ آگے بڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور حر کی طرف سے بھی اس راستے میں کوئی سختی نہیں ہے یہاں تک کہ یہ قافلہ "نینوا" کی زمین پر پہونچا یہاں ایک سوار مسلح کوفہ کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیا اور سب کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پہونچا تو اُس نے حر اور اصحاب حر کو تو سلام کیا لیکن حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کو سلام نہیں کیا۔ یہ قاصد ابن زیاد کا تھا جو حر کے نام کا خط لایا تھا اُس میں لکھا تھا۔

اما بعد فجعجع بالحسین حین یبلغک کتابی ویقدم علیک رسولی فلا تنزلہ الا بالعراء فی غیر حصن وعلی غیر ماء وقد امرت رسولی ان یلزمک ولا یفارقک حتی یاتینی بانفاذک امری والسلام۔

"تم کو لازم ہے کہ جہاں پر یہ خط پہونچے وہیں پر حسینؑ کو آگے بڑھنے سے روک دو اور انھیں ایسی جگہ قیام کرنے پر

مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ و جائے پناہ ہو اور میں نے اپنے فرستادہ کو حکم دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے اور تم سے جدا نہ ہو جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔ والسلام

بظاہر یہ خط نتیجہ ہے اس کا کہ ابن زیاد کو حر کے اُس طرز عمل کی اطلاع ہو گئی جو اُس نے امامؑ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ حر کا اپنی فوج سمیت امام کی اقتدا میں نماز پڑھنا اور پھر امام کی خاطر سے کم از کم اپنے اس مطالبہ سے ہٹ جانا کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جائے جائیں گے اور پھر حضرت کے ساتھ بار بار گفتگو اور ذکر مصالحت یہ چیزیں ایسی تھیں کہ ابن زیاد کو حر کے متعلق بے اطمینانی پیدا ہو اور وہ حر کے لیے اس سختی کا اظہار کرے۔

حر امامؑ کی تمام عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پھر بھی ابھی دنیا کا بندہ تھا اور وہ اپنے جاہ طلبی کے مقصد سے ابن زیاد کی مخالفت کرنا ہرگز پسند نہ کر سکتا تھا اِس لیے ہزار ناچاری و مجبوری اور ناخوشگی طبع کے باوجود بھی اُس کو ابن زیاد کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری تھی۔ چنانچہ اس خط کو دیکھتے ہی اُس نے امامؑ اور آپ کے اصحاب کے سامنے یہ اعلان کر دیا کہ

ھذا کتاب الامیر عبید اللہ بن زیاد یامرنی فیہ ان

اجعجع بکوفی المکان الذی یاتینی فیہ کتابہ وھذا رسولہ وقد امرہ ان لایفارقنی حتی انفذ رایہ وامرہ۔

یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے اور اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم سب کو اس جگہ اترنے پر مجبور کروں جہاں مجھے یہ خط پہونچ رہا ہے اور یہ ابن زیاد کا قاصد ہے اور اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے علیحدہ نہ ہو جب تک اس حکم کی تعمیل نہ ہو جائے"۔

اس کے معنی یہ تھے کہ اب امامؑ کے سامنے آگے بڑھنے میں پھر جنگ کی صورت تھی یعنی اب بغیر جنگ کیے ہوئے آپ آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ آگے بڑھنے کی صورت میں اگر آپ کو کوئی اہم مرکز پیش نظر ہوتا کہ جہاں جاکر آپ قیام کریں تو اچھا یوں بھی سہی۔ ان لوگوں سے اپنے مقصد میں سدّراہ ہونے کی بنا پر جنگ بھی کرلی جائے۔ لیکن جب کہ آپ کے سامنے کوئی خاص مرکز نہیں ہے کہ جس طرف جائیں۔ اور نتیجہ میں پھر ابن زیاد کے افواج ہی میں گھرنا ہے تو صرف اس بات پر جنگ کرنا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ آگے بڑھیں گے ایک لاحاصل سی بات ہے۔

جنگ ہو تو پھر وہی آخری جنگ ہو جس میں بیعت اور عدم بیعت کا سوال تھا اور جو آپ نے مدافعانہ صورت سے بہترین طریقہ پر انجام دی۔

لیکن ابھی آپ اپنی طرف سے امن پسندی ورواداری کا ثبوت

کیوں نہ دیں کہ اچھا تم کہتے ہو تو ہم یہیں قیام کر لیں گے۔ دیکھیں آیندہ حالات کی رفتار کیا ہو، چنانچہ آپ وہیں قیام کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن آپ نے اتنا کہا کہ ہم کو اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام نینوا ہے۔ یا اس قریہ میں جس کا نام غاضریہ یا اس میں جس کا نام شفیۃ ہے لیکن حر نے کہا کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ بس چٹیل میدان میں آپ کو اتار دوں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگراں مقرر کیا گیا ہے کہ یہ جا کر میرے طرز عمل کی اطلاع دے۔

اس موقع پر اصحاب کو بے شک جوش پیدا ہو گیا تھا اور زہیر بن قین نے عرض کی یا ابن رسول اللہ ان قتال ھؤلاء اھون من قتال من یاتینا من بعد ھم فلعمری لیاتینا من بعد من تری مالا قبل لنا بہ۔

"فرزند رسولؐ! ان لوگوں سے جنگ کر لینا آسان ہی ہمارے لیے اُن لوگوں سے جنگ کی بہ نسبت جو ان کی بعد آئیں گے۔ کیونکہ ان کے بعد اتنے افواج آجائیں گے جن کے مقابلہ کی ہم کو طاقت نہ ہو گی۔" اس کے معنی یہ تھے کہ اُن سے ہم کو نپٹ لینے دیجیے لیکن حضرت نے فرمایا۔

ماکنت لابدأھم بالقتال" میں جنگ میں ابتدا، تو کرنا ہی نہیں چاہتا"۔

آخر امامؑ کا مرکب رُکا اور اُس صحرا میں آپ اُتر پڑے جس کا نام ہے "کربلا"۔ اور حضرت نے فرمایا: انزلوا ھھنا محط رکابنا وسفك دمائنا۔

"اُترو میرے ساتھیو! بس یہیں ہمارے خیمے نصب ہوں گے اور یہیں ہمارے خون زمین پر بہائے جائیں گے۔"

یہ دوسری محرّم پنجشنبہ کے دن کا ذکر ہے۔

آٹھواں باب

مدینہ کا شہنشاہ کربلا کے جنگل میں

صحرانورد غربت حسینؑ کی آخری منزل کربلا میں قرار پاگئی۔ ناحق شناس دشمن نے اپنے ملک میں آنے والے پردیسی مسافر کی خاطرداری یہ کی کہ خیمے بھی نہر کے قریب کسی مقام پر قائم نہ کرنے دیئے، بلکہ ایسی جگہ چٹیل میدان میں اُترنے پر مجبور کیا جہاں پانی بھی قریب نہ ہو۔

"کربلا" کا قدیم جغرافیہ

بہت سی ایسی چیزیں جن میں تاریخی اہمیت کسی بعد والے

واقعہ سے پیدا ہو گئی ہے، اپنی سابقہ تاریخ کے اعتبار سے تاریکی میں ہوا کرتی ہیں۔

کربلا کی بھی حیثیت یہی ہے۔ ایک چٹیل میدان، ریتلی زمین، بے آب و گیاہ جنگل، جہاں کسی قسم کی دلچسپی و دلبستگی کا وجود نہیں۔ اُس کے متعلق کسی مورّخ، واقعہ نگار، جغرافیہ نویس کو کیا پڑی تھی کہ وہ اُس کا نام لیتا یا ذکر کرتا، اور پھر جب کہ عرب میں یہ علوم بحیثیت ایک فن و علم کے پائے ہی نہیں جاتے تھے بلکہ اُن کے اشعار اور ذکر حروب و واقعات کی نظمیں ہی تھیں جن سے اُن کے تاریخی و جغرافیائی معلومات کی تدوین کی جاتی ہے، تو ایک ایسا مقام جو پہلے کوئی تاریخی حیثیت نہ رکھتا ہو، اس کے متعلق کسی قسم کے معلومات کا حاصل کرنا اُس زمانہ کی تاریخ سے ناممکن و محال کا درجہ رکھتا ہے۔

کسی تاریخ نویس اور واقعہ نگار کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک وقت یہ زمین ایک عظیم مجاہدۂ حق و باطل کا محل بن کر قیامت تک کے لیے اہل دل کے دلوں کا مرکز اور قبلۂ توجہ بن جائے گی، اور کعبہ کی طرح یہ زمین ظاہری جسموں کی نہیں تو نفوس و ارواح کی محل طواف و سجدہ گاہ بنے گی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ میری ناقص جستجو نے جہاں تک رسائی حاصل کی، قدیم اشعار عرب اور تاریخی روایات میں مجھے کہیں

کربلا کا پتہ نہیں چلا۔

بے شک اُن احادیث سے جو شہادت امام حسینؑ کے متعلق وارد ہوی ہیں، اور اُن واقعات سے جو سنہ ۶۱ھ کی پہلی تاریخ سے ہمارے سامنے گذرے ہیں، ایک حد تک کربلا کے جغرافیہ کا اندازہ ہوتا ہے، اور اُس کو ان واقعات کی نوعیت سمجھنے میں بڑا دخل حاصل ہوتا ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظر کے مطابق درج کرتے ہیں۔

"کربلا" کا نام، واقعات شہادت کے قبل کے احادیث میں موجود ہے۔ یہ درحقیقت مجموعہ تھا چند زمینوں اور قریوں کا جو بالکل قریب قریب واقع تھے ــــــ میرے خیال میں زمینداریوں اور جاگیروں کے سلسلہ میں ہر ملک میں ایسا موجود ہے اور خصوصیت سے عرب میں پایا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے قطعات ارض کے مستقل نام مقرر ہوتے تھے، جنھیں اگر ہر ایک مقام کی خصوصیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ متعدد مقامات ہیں، اور اگر اُن کے باہمی قرب پر نظر ڈالی جائے تو وہ سب ایک ہی ہیں۔ اور ایک جگہ کا واقعہ دوسرے طرف منسوب ہوسکتا ہے۔

اشعار عرب کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ کسی مکان یا کسی واقعہ کے محل وقوع کا پتہ دینے میں وہ کس طرح بہت سے نام لے دیتے ہیں۔ مشہور معلقۂ امرأالقیس کا مطلع ہی ملاحظہ ہو۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحومل

فتوضح فالمقراۃ لم یعف رسمہا   لما نسجتہا من جنوب و شمال

"دخول" "حومل" "توضح" "مقراۃ" یہ سب مستقل مقامات ہیں جو باہمی قرب کی وجہ سے صرف ایک گھر کے محل وقوع کی شناخت کے لیے ذکر ہوئے ہیں۔

اسی صورت سے بالکل واقعۂ کربلا کے محل وقوع کے سلسلہ میں جو بہت سے نام گوش زد ہوتے ہیں "کربلا" "نینوا" "غاضریۃ" "شط فرات" انھیں ایک ہی جگہ کے متعدد اسماء خیال کرلینا بالکل صحیح نہیں ہے۔

حقیقۃً یہ متعدد جگہیں تھیں جو باہمی قرب کی وجہ سے ایک بھی سمجھی جاسکتی تھیں اور اس لیے محل وقوع کے اعتبار سے ہر ایک کا نام تعارف کے موقع پر ذکر کیا جانا صحیح قرار پاتا تھا جیسا کہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی طاب ثراہ نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے۔

"نینوا" جس کا صحیح تلفظ نون کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ ایک قریہ تھا۔ جسے موجودہ زمانہ کے "سدۂ ہندیہ" کے قریب سمجھنا چاہیے۔ اس کے پہلو میں "غاضریۃ" تھا۔ یہ قبیلۂ بنی اسد کی ایک شاخ "بنی غاضرہ" کی طرف نسبت رکھتا ہے۔ اور انہی کا محل سکونت تھا۔ یہ غالباً وہ زمین ہے جو اب "حسینیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی جگہ ایک قریہ "شفیّہ" تھا۔ اور یہیں پر ایک قطعۂ زمین "کربلہ"

تشدید لام کے ساتھ پایا جاتا تھا، وہ اب موجودہ شہر کربلا کے مشرقی جانب جنوب کی طرف واقع ہے۔ اور اُس کے متصل "کربلا" اور "عقر بابل" نام قریہ تھا، جو غاضریات کے شمالی غربی میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈر ہیں، جہاں بہت آثار قدیمہ کا انکشاف ہونے کی اُمید ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پر تھا اور اپنے قدرتی محل وقوع یعنی ٹیلوں سے گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے مقابل غاضریات کے دوسری جانب "نوادیس" کا مقام تھا جو اسلامی فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سب کے وسط میں زمین "حیر" تھی جو اب "حائر" کے نام سے معروف ہے، اور جہاں حضرت حسینؑ بن علیؑ کی قبر مبارک ہے۔ "حیر" ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور پہلو بہ پہلو ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرقی کی طرف سے جدھر اب حرم حسینی کا "باب السدر" اور "منارہ عبد" ہے شروع ہو کر غرب کی جانب "باب زینبیہ" کے حدود تک پہونچتا تھا اور وہاں سے پیچیدہ ہو کر جنوب کی طرف "درقبلہ" کے مقام تک آکر ختم ہوتا تھا۔ ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی جو "ن" کی صورت سمجھی جاسکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے کا راستا مشرقی جہت میں اُس جانب سے تھا کہ جدھر روضۂ حضرت

ابوالفضل العباسؑ کی طرف جانے کا راستا ہے۔ تحقیقاتی انکشاف سے اب تک یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن مکانات کے آثار میں جو قبر امام حسینؑ کے گرد ہیں، شمالی اور مغربی جانب زمین کے قدیمی بلندی دار تفاع کے آثار موجود ہیں اور مشرقی جانب سوا نرم مٹی کے جو پستی کی طرف مائل ہے، کچھ نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت ایسی ہی تھی کہ شرق کی جانب سے ہموار اور شمال و غرب کی جانب سے ہلالی شکل پر بلند تھی۔

یہی ہلالی دائرہ وہ ہے جس میں فرزند رسولؐ کو اس موقع پر گھیر لیا گیا تھا، جب کہ آپ کی شہادت ہوئی ہے۔

"نینوا" اور "غاضریہ" کی مغایرت کا پتہ تاریخ کے ان الفاظ سے چلتا ہے کہ قالوا دعنا ننزل فی ھذہ القریۃ یعنون نینوا او ھذہ القریۃ یعنون الغاضریۃ او ھذہ الاخریٰ یعنون شفیہ۔

"اصحاب امام حسینؑ نے کہا کہ ہم کو اس قریہ میں قیام کرنے دو۔ جس کا نام "نینوا" ہے، یا اس میں جس کا نام "غاضریہ" ہے، یا اس میں جس کا نام "شفیہ" ہے۔

اس کے بعد زہیر بن قین کی تقریر لکھی ہے کہ انھوں نے کہا سر بنا الی ھذہ القریۃ حتیٰ ننزل فانھا حصینہ وھی

علی شاطئ الفرات۔

"چلئے اس قریہ میں چل کے قیام کیجیے۔ یہ قلعہ کی صورت سے محفوظ ہے اور فرات کے کنارے ہے۔ امام حسینؑ نے دریافت کیا۔ وایۃ قریۃ ھی "کون سا قریہ ہے یہ"؟ کہا ھی العقر اس کا نام "عقر" ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ اللّٰھم انی اعوذبک من العقر "خداوند میں تجھ سے "عقر" یعنی بے اولاد ہونے سے پناہ مانگتا ہوں۔ (طبری مطبوعہ مصر ج ۶ ص ۲۳۲)

اس سے "عقر بابل" کے قریہ کا پتہ چلتا ہے۔ جس کا نام "کربلا" تھا۔ اس "کربلا" اور اس کے مقابل "نوادیس" اور ان دونوں سے محل شہادت امام حسینؑ کی مغایرت کا پتہ اس تقریر کے الفاظ سے چلتا ہے جو امامؑ نے مکۂ معظمہ سے روانگی کے موقع پر فرمائی تھی، جس میں فرمایا ہے کانی انظر باوصالی تقطعھا عسلان الفلوات بین النوادیس وکربلا "میرے پیش نظر ہے وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے، مقام "نوادیس" اور کربلا کے درمیان۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محل شہادت "کربلا" اور "نوادیس" دونوں کے درمیان کا مقام ہے، اور عین "کربلا" نہیں ہے۔

بے شک اس مقام "کربلا" کی اہمیت کی بنا پر جس کے متعلق

ہم نے بیان کیا کہ اُسکی محلّ وقوع کی حیثیت سے ایک محفوظ قلعہ
کی شکل تھی، اور وہاں آثار قدیمہ بھی کافی مقدار میں پائے جاتے
تھے۔ ممکن ہے کہ پورا یہ علاقہ "کربلا" کہا جانے لگا ہو جیسا کہ اکثر ضلعوں
اور صوبوں کے اسمار میں ایسا ہوتا ہے۔ خود ہمارے صوبہ میں اصلاً
"اودھ" ایک خاص مقام تھا جو اب "اجودھیا" کے نام سے
موسوم ہے اور اس کے لحاظ سے پورا صوبہ "اودھ" ہو گیا۔

فرات کی اصلی نہر ہماری زبان کے اعتبار سے "دریائے فرات"
کہنا چاہیے" اُسے براہ راست کوئی تعلق اس کربلا کی زمین سے نہیں
تھا۔ اس کا خطّ سیر حلّہ، مسیّب وغیرہ مقامات سے ہوتے ہوئے
کوفہ کے بیرونی حصّوں کی جانب جاتا تھا اور اُن قریوں کو سیراب
کرتا تھا اور کربلا میں اور اس میں بڑا فاصلہ ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ
سید ہبۃ الدین شہرستانی نے لکھا ہے اس نہر یا "دریائے فرات"
سے ایک چھوٹی شاخ مقام "رضوانیہ" کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی
تھی جو کربلا کے شمالی مشرقی جانب کے ریگستان اور نشیبوں سے
ہوتی ہوئی اُس مقام کے قریب سے گذرتی تھی جہاں حضرت
ابوالفضل العباسؑ کی قبر ہے، اور اس کے بعد موجودہ مقام "ہندیہ"
کے اطراف سے ہوتی ہوئی اُس مقام کے مغربی شمالی جانب
جس کا نام قریۂ "ذی الکفل" ہے اصل دریائے فرات سے ملحق
ہو جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر فرات کا ایک شعبہ تھا اور "نہر علقمی" کے نام

سے موسوم تھا، اور اُسے اپنی اصل کے اعتبار سے "فرات" کہا جاتا تھا۔

طف کے معنی ہیں "نہر کا کنارہ" خصوصیت سے دریائے فرات کے اُس کنارہ کو جو جنوبی پہلو میں "بصرہ" سے "ہیت" تک تھا۔ "طف" کہا جاتا تھا۔ اور اُسی مناسبت سے "فرات صغیر" یعنی "نہر علقمی" کے اس کنارہ کو جس میں کربلا واقع تھا "طف" کہا جانے لگا۔ اور اس وجہ سے کربلا کے واقعہ کو "وقعۃ الطف" کہا جاتا ہے، اور کربلا کے لیے شطّ فرات کی لفظ بھی اسی اعتبار سے قرار پائی ہے۔

نواں باب

کوفہ میں اطلاع

حسینؑ کربلا میں ٹھہر گئے، ابن زیاد کے فرستادہ "حر بن یزید" نے ابن زیاد کو اس کی اطلاع دی۔

مشہور فاتح عراق سعد بن ابی وقاص کا بیٹا عمر بن سعد اس وقت ملک عجم میں برپا شدہ بغاوت کی بنا پر جس میں "دستبی"

کے مقام پر قبیلۂ دیلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرد کرنے کے لیے چار ہزار فوج کا سردار بنایا جا چکا تھا، اور ابن زیاد اُس کے لیے "حکومت رے" کا پروانہ بھی تحریر کر چکا تھا، وہ اس فوج کو لیے کوفہ کے باہر مقام "حمام اعین" میں خیمہ زن تھا، اور عنقریب روانہ ہونے والا تھا۔

اب امام حسینؑ کا معاملہ جو پیش آیا تو ابن زیاد نے عمر سعد کو مامور کیا کہ پہلے اس مہم کو سر کرو پھر اپنے مقصد کے لیے روانہ ہونا۔

ابن سعد کو جرم کی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھ کو کس سے لڑنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ اُس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کیجیے تو بہت بہتر ہے ابن زیاد نے کہا، اچھا مگر ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کر دو۔"

عمر سعد کو "رے" کی حکومت دل سے عزیز تھی۔ جاہ طلبی اور حق شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوی۔ اور خواہش دلی اور ضمیر میں جنگ۔

عمر سعد کو یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگنا پڑی، اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب اور اعزہ سے مشورہ لینا شروع کیا سب نے مخالفت کی اور اس مہم کے لیے جانے سے منع کیا۔ حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ جو اُس کا بھانجا تھا، اُس کی تقریر یہ تھی کہ انشدک اللہ یا خال ان

تسیر الی الحسین فتأثم بربک وتقطع رحمک فواللہ لان تخرج من دنیاک ومالک وسلطان الارض کلھا لو کان لک خیر لک من ان تلقی اللہ بدم الحسینؑ۔

"میں آپ کو قسم دیتا ہوں خدا کی کہ آپ حسینؑ سے جنگ کو نہ جائیے اور گناہگار ہونے کے ساتھ رشتۂ قرابت قطع کرنے کے مرتکب نہ ہوجیے۔ خدا کی قسم اگر تمام دنیا اور مال و دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسینؑ کے خون کا بار اپنی گردن پر لیجیے۔" (طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۳)

یہ وہ پہلو تھا جسے سچے مشیر کار پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف جاہ طلبی کا جذبہ یہ پہلو پیش کر رہا تھا کہ ابن زیاد نے پروانۂ حکومت اگر واپس لے لیا تو کیا ہوگا؟ رے کی اتنی بڑی حکومت ہاتھ سے جائے گی۔ ہم چشموں میں ذلت برداشت کرنا پڑے گی۔ اتنے بڑے منصب سے محروم ہونا پڑے گا اور پھر جب کہ حسینؑ کے قتل کا جو کچھ جرم ہے اُس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہوگا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں، اور اس صورت میں جو نتیجہ ہے وہ وقتی ہے۔ رے کی نقد حکومت چھوڑ کے آخرت کے راحت و آرام کی اُمید باندھنا کسی سمجھدار آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہی وہ خیالات تھے

ن کو اُس کے منظوم اشعار تاریکی شب کے پردہ میں بستر
تنہائی پر جبر دت و اضطراب کی کروٹوں کے ساتھ ظاہر
کر رہے تھے۔[1]

آخر دنیا کی وقتی دلفریبی غالب ہوئی اور اُس نے
رسولؐ کے فرزند سے جنگ پر کمر باندھ لی۔

بے شک ضمیر کی چٹکیوں نے ایک آخری مرتبہ اُس کو
ابن زیاد سے ظاہری انکار پر مجبور کیا کہ شاید اسی مرتبہ بغیر
کسی دنیوی نقصان کے قتل حسینؑ کے جرم سے نجات مل جائے
اُس نے ابن زیاد سے آکر کہا کہ آپ مجھ کو "دستبی" اور "دیلم"
کے حدود کی طرف جانے پر مامور کر چکے ہیں، لوگوں کو اس کا
علم بھی ہو گیا ہے۔ اور میری فوج والوں نے بھی وہیں جانے
کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھ کو اُدھر روانہ کیجیے
اور حسین بن علیؑ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو
اشراف اہل کوفہ میں سے جو کسی طرح شخصیت و شہرت
اور فن سپہ گری و مہارت جنگ میں مجھ سے کم نہیں ہیں
روانہ کر دیجیے۔ عمر سعد نے چند آدمیوں کا سرداران کوفہ میں
سے نام بھی لیا۔ لیکن ابن زیاد برہم ہو گیا، اُس نے کہا کہ تمھیں
سرداران کوفہ کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔

... "قاتلانِ حسینؑ کا مذہب"

اور مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہو تو تمہارے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی کہو اگر تمھیں ہماری فوج کے ساتھ جانا ہے تو جاؤ، نہیں تو ہمارا پروانہ جو حکومت رے کے متعلق ہے، واپس کر دو۔

عمر سعد نے دیکھ لیا کہ بے شک سوال دین و دنیا کا ہے، اور سخت ہے۔ کہا کہ اچھا جاؤں گا۔

چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کمربستہ موجود تھی۔ لے کر وہ روانہ ہو گیا، اور امام حسینؑ کے ورود کربلا کے دوسرے ہی دن یعنی تیسری محرم کو کربلا میں پہونچ گیا۔ (طبری جلد ۶ صـ۲۳۳، الاخبار الطوال لـ۲۵)

دسواں باب

کوششِ صلح

عمر سعد کا دل حسین بن علیؑ کی جنگ سے پہلے ہی لرزاں تھا۔ کربلا آ کر اس نے معاملات کے رو بہ اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ عزرہ بن قیس احمسی سے کہا کہ وہ امام حسینؑ کے پاس

جاکر آپ کے مقصد، نصب العین اور نقطۂ نظر کو دریافت کرے۔
اتفاق سے عزرہ بن قیس اُن لوگوں میں سے تھا، جنھوں نے امام حسینؑ کو دعوتی خطوط لکھے تھے، اور کوفہ کی طرف آپ کے آنے کی خواہش کی تھی۔ اُس کو آپ کے پاس جانے سے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے شرم دامن گیر ہوئی۔ اور اُس نے صاف انکار کیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔
دوسرے ایسے ہی اشخاص کہ جو خطوط لکھ چکے تھے انھیں بھی جانے میں اس صورت سے توقف ہوا۔ اور آخر کثیر بن عبداللہ شعبی ایک درشت خو، سخت مزاج انسان یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے پر تیار ہوں، بلکہ اگر مجھے حسینؑ کے قتل کرنے کا حکم ہو تو میں اس مہم کو ابھی انجام دے دوں۔ عمر سعد نے کہا نہیں یہ تو مجھے منظور نہیں ہے۔ تم بس جاکر اتنا دریافت کرلو کہ آپ اس ملک میں آئے کس لیے ہیں؟ کثیر لشکر امام کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثمامہ صائدی جو شاید اس وقت خیمۂ امام حسینؑ پر پہرہ دے رہے تھے، اُنھوں نے دور سے دیکھ لیا، اور امامؑ سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بڑا پُرجگر لیکن بدترین خلق خدا انسان اور انتہائی سفاک و خوں ریز شخص آرہا ہے۔
اس کے بعد آئے اور کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کے

رکھ دینے کا مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا نہیں، یہ نہیں ہو سکتا میں پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر تم اس پیغام کو سُنو تو میں کہہ دوں نہیں تو واپس جاؤں گا۔

وفادار اور امامؑ کی سلامتی کے خیر خواہ و جاں نثار ابو ثمامہ کو کسی طرح یہ گوارا نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس سلح شوری کے ساتھ ساتھ اسلحہ لے کر امام کے پاس جائے۔ انھوں نے کہا کہ اچھا کم از کم میں تمہاری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تم کو لے جاؤں گا۔ شیطنت مزاج النسان نے کسی طرح اس کو نہ مانا اور کہا کہ ہرگز نہیں، تم میری تلوار کو ہاتھ بھی لگانے نہ پاؤ گے۔ ابو ثمامہ نے کہا "تو پھر تم اپنا پیغام مجھ سے ہی کہہ دو، میں اُس کا جا کر جواب لے آؤں گا۔ تمھیں میں اس طرح سے قریب نہیں جانے دوں گا۔

آخر آپس میں سخت کلامی ہوگئی، اور کثیر واپس ہو گیا عمر سعد کو تمام واقعہ سے مطلع کیا۔ اُس نے قرہ بن قیس حنظلی کو بلایا، اُس سے کہا کہ تم جا کر دریافت کر لو کہ آپ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں۔

چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا، امامؑ نے جو اُسے آتے دیکھا دریافت فرمایا تم لوگ اس کو پہچانتے ہو؟ حبیب بن مظاہرؓ

نے کہا "جی ہاں، یہ ایک شخص ہے قبیلہ حنظلہ کا بنی تمیم میں سے، اور اپنی ننھیالی رشتہ داری سے ہمارا عزیز ہوتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس کو جانتا ہوں، اور سنجیدہ اور فرزانہ شخص سمجھتا تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ اس موقع پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل آئے گا۔"

وہ آیا، امام حسینؑ کی خدمت میں تسلیم بجا لایا، اور عمر سعد کا پیغام پہونچایا۔ حضرت نے فرمایا کتب الیّ اھل مصرکم ھذا ان اقدم فاما اذکرھونی فانا انصرف عنھم۔

"مجھ کو تمہارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن اب جب کہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

حبیب بن مظاہرؓ کو موقع تبلیغ کا مل گیا تھا، کہنے لگے، اے قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو۔ آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو، جس کے بزرگوں کی بدولت تمہاری اور ہماری ہدایت ہوئی ہے۔ قرہ نے کہا میں جو پیغام لایا تھا اُس کا جواب پہونچا دوں، پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔" وہ گیا اور عمر سعد سے پورا جواب امام حسینؑ کا بیان کیا۔

جواب انتہائی رواداری و صلح پسندانہ تھا۔ عمر بن سعد کو بھی

توقع قائم ہوئی کہ اب صلح ہو جائے گی۔ اُس نے عبیداللہ بن زیاد کے نام خط لکھا:

اما بعد فانی حیث نزلت بالحسین بعثت الیہ رسولی فسالت عمّا قدمہ وماذا یطلب ولیسأل فقال کتب الیّ اھل ھذہ البلاد واتتنی رسلھم فسأ لونی القدوم ففعلت فامّا اذکرھونی فبدالھم غیرما اتتنی بہ رسلھم فانا منصرف عنھم۔

"میں نے یہاں پہونچ کر حسینؑ کے پاس اپنا نمایندہ بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں آئے ہیں، اور کیا چاہتے ہیں، کیا مطالبہ کرتے ہیں؟ اُنھوں نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھ کو لکھا تھا اور میرے پاس اُن کے قاصد گئے تھے، اور مجھے ادھر آنے کی دعوت دی تھی، لیکن اب جب وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور اُن کے خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں اُدھر ہی واپس چلا جاؤں گا۔

خط پہونچا، ابن زیاد نے پڑھا اور غرور، دنیا کے گھمنڈ اور تکبّر، فرعونیت اور ذوق ظلم و سفاکی کے ساتھ یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا۔

الآن اذ علقت مخالبنا بہ   یرجوا النّجاۃ ولات حین مناص

"اب جب کہ ! ہمارے چنگل اُن تک پہونچ گئے ہیں، وہ نجات

کے طالب ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے"۔
اس قسم کے واقعات وہ ہوتے ہیں، جن میں امن پسندی اور فتنہ جوئی، سلامت روی اور جفا کیشی، دونوں متضاد رقیعے انسان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اُسے موازنہ کا اچھی طرح موقع ملتا ہے۔

ابن زیاد نے عمر سعد کو خط لکھا:

امّا بعد فقد بلغنی کتابک وفہمت ما ذکرت فاعرض علی الحسین ان یبایع لیزید بن معاویۃ ہو وجمیع اصحابہ فاذا فعل ذٰلک رأینا والسلام۔

"خط پہونچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسینؑ کے سامنے یہ سوال پیش کرو کہ وہ اور اُن کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کر لیں۔ جب وہ ایسا کر چکیں گے تو پھر ہم اپنی رائے قائم کریں گے"۔

ابن زیاد کی فتنہ پسندی اس خط سے اتنی ظاہر تھی کہ عمر سعد بھی بے ساختہ اُس کا اظہار کر بیٹھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بیعت یزید کا سوال حسینؑ بن علیؑ کے سامنے پیش کرنا گویا کفر و شرک کے ارتکاب پر اصرار کرنا ہے۔ وہ حسینؑ کی مذہبی خودداری سے ناممکن سمجھتا تھا کہ وہ یزید ایسے فاسق و فاجر کی بیعت کریں۔
اُس نے ابن زیاد کا خط پڑھ کر کہا۔ قد حسبت ان لا یقبل

ابن زیاد العافیة۔

"اب میں سمجھ گیا کہ ابن زیاد امن وسکون کا خواہاں نہیں ہے لیکن پھر بھی اُس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسینؑ کے پاس بھیج دیا امام حسینؑ بے شک اپنے باپ کا دل اپنے سینے میں رکھنے والے ہیں جو کہا کرتے تھے کہ مجھے موت سے وہ محبت ہے جو بچہ کو شیر مادر سے ہوتی ہے، وہ اس سوال بیعت کا کیا جواب دیتے، فرمایا:

"لا اجیب ابن زیاد الی ذلک ابداً فھل ھو الا الموت فمرحبا بہ۔

"میں ہرگز ابن زیاد کے اس مطالبہ کو پورا نہیں کروں گا زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں" (الاخبار الطوال صہ ۲۵۲)

گیارہواں باب
فوجوں کی چڑھائی

حُر کے ساتھ ایک ہزار کی فوج تھی جو پہلے ہی سے موجود تھی

عمر سعد کے ساتھ بھی چار ہزار کا لشکر آیا۔ یہ پانچ ہزار ہوئے تنِ تنہا حسینؑ بن علیؑ اور اُن کے گنتی کے ساتھیوں کے مقابلہ کے لیے یہ تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ مگر حسینؑ کی خاندانی شجاعت اور اُن کے ساتھیوں کے حقانی زور و طاقت کا ابن زیاد کے دل میں کیا دھڑکا سمایا ہوا تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو کم سمجھتا رہا۔

ابن سعد نے امام حسینؑ کا جواب ابن زیاد کو لکھ دیا جس پر اُس کا غصہ برافروختہ ہو گیا۔ وہ خود اپنے تمام حشم و خدم کے ساتھ کوفہ سے باہر نخیلہ میں آکر خیمہ زن ہو گیا اور بڑے بڑے سرداران کوفہ حصین بن تمیم، حجار بن ابجر، شبیث بن ربعی وغیرہ کو مامور کیا کہ وہ عمر سعد کی امداد کو جائیں۔

مجھ کو لشکر کی اُس تعداد سے بحث نہیں ہے جو مورخین نے تحریر کی ہے۔ بیس ہزار، بائیس ہزار، تیس ہزار، اسی ہزار، ایک لاکھ دو سو آٹھ لاکھ۔ اور نہ علماء کے اقوال سے بحث ہے جنھوں نے ان میں سے کسی روایت کو ترجیح دی ہے۔ جیسے علامہ مجلسی نے تیس ہزار کی روایت کو، اور ابن طاؤس نے بیس ہزار اور ابن شہر آشوب نے پینتیس ہزار۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا صحیح فیصلہ ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے نہ کوئی باقاعدہ فوج کا حساب ہو رہا تھا، نہ فہرست مرتب تھی۔

نہ کسی حاضر الوقت نے اُس کی تعداد بتلائی ہے، اور نہ امامؑ سے کوئی حدیث مذکور ہوئی ہے۔ پھر اس تعداد کو معینہ حیثیت سے مقرر کرنے کا ذریعہ ہی کیا ہے۔ لیکن میں وہ صورتیں پیش کرتا ہوں جو تاریخ نے عام فوجی بھرتی کی قلم بند کر دی ہیں، اور اُن سے ایک اجمالی خاکہ کثرت لشکر کا سامنے آجائے گا، جیسے انسان اپنے ذہن کے موافق ان روایات میں سے جس کے مطابق سمجھ سکے۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔

میں لکھ چکا ہوں کہ پانچ ہزار فوج تو کربلا میں گنی ہوئی اور شمار کی ہوئی پہلے سے موجود تھی۔ ابن زیاد وہ ظالم و سفاک حاکم، جس کے خوف سے کوفہ کی خلقت لرزہ بر اندام تھی، اُس کا یہ جوش و خروش و انہماک بھی دیکھ لیا گیا کہ وہ خود دارالامارہ کو چھوڑ کر نخیلہ میں آکر مقیم ہو گیا، تاکہ خود وہاں افواج کا جائزہ لے اور یہاں سے افواج روانہ کیے جائیں۔

ہماری متعدد پہلے کی کتابوں میں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ حصین بن تمیم کی سرکردگی میں پہلے ہی سے کئی ہزار کی فوج موجود تھی جو قادسیہ سے لے کر قطقطانہ لعلع اور خفان وغیرہ کے چاروں حدود تک ناکہ بندی کے سلسلہ میں مقیم تھی، انہی میں سے حر کا ایک ہزار کا رسالہ تھا جو امام حسینؑ کو گھیر کر کربلا میں لایا۔

اب آپ نے اُن سرداروں میں کہ جو کربلا بھیجے جا رہے ہیں۔

حصین بن تمیم کا نام بھی پڑھ لیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پوری کئی ہزار کی فوج کربلا بھیج دی گئی۔

حجار بن ابجر، شبث بن ربعی، عمرو بن حجاج وغیرہ بھی بڑے سردار ہیں۔ ان کو بھی ایک اکیلا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اُن میں سے ہر ایک کثیر التعداد فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔

بے شک، بہت سے ایسے بھی تھے جن کو حسینؑ سے جنگ کو جانا ناگوار خاطر تھا، مگر ابن زیاد کے حکم کے سامنے اپنی ذاتی ناگواری کوئی چیز نہ تھی۔ بعض اشخاص ابن زیاد کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے۔ جس کا ابن زیاد کو خاص طور سے احساس ہو گیا۔ مورخ دینوری کا بیان ہے۔

كان ابن زياد اذا وجه الرجل الى قتال الحسين في الجمع الكثير يصلون الى كربلاء ولم يبق منهم الا القليل كانوا يكرهون قتال الحسين فيرتدعون ويتخلفون فبعث ابن زياد سويد بن عبد الرحمن المنقري في خيل الى الكوفة وامره ان يطوف بها فمن وجده قد تخلف اتاه به فبينا هو يطوف في احياء الكوفة اذ وجد رجلا من اهل الشام قد كان قدم الكوفة في طلب ميراث له فارسل به الى ابن زياد فامره فضربت عنقه فلما راى الناس ذلك

"ابن زیاد لوگوں کو بڑی بڑی جمعیتوں کے ساتھ حسینؑ سے جنگ کرنے کو بھیجتا تھا، وہ کربلا پہونچ جاتے تھے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو حسینؑ سے جنگ کو ناگوار سمجھتے تھے، اور وہ فوج سے الگ ہو کر کوفہ میں رہ جاتے تھے۔ ابن زیاد نے سوید بن عبدالرحمٰن منقری کو تھوڑے سے سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے اور حسینؑ سے جنگ کو نہ گیا ہو اس کو گرفتار کر کے لے آیا جائے۔ سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی۔

ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی متروکہ کے جھگڑے میں کوفہ آیا ہوا تھا، سوید نے اُسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دیا اور اُس نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ خوف اور دہشت کا اثر پورے طور سے قائم ہو گیا، اور تمام لوگ حسینؑ سے جنگ کرنے کے لیے باہر آ گئے۔"

(الاخبار الطوال ص۲۵۲)

اب کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ کوفہ کربلا میں اُنڈل آیا اور کربلا کی زمین فوج کی کثرت سے سمندر کی طرح موجیں مارنے لگی۔

بارھواں باب

پانی کی بندش

اللہ! ایک وقت وہ تھا کہ خلیفۂ ثالث مدینہ کے دارالامارہ محصور تھے۔ مصر کے حملہ آور چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوئے تھے، پانی کی کمی ہوئی تو حسینؑ، انہی مظلوم حسینؑ کے پدر بزرگوار ابن ابی طالبؑ نے مشکیں پانی کی دارالامارہ میں بھجوا دی تھیں، اور انہی حسینؑ اور ان کے بڑے بھائی حسن مجتبیٰؑ کو بھیجا تھا کہ دیکھو پانی پہونچنے میں رکاوٹ نہ ہونے پائے۔

مگر افسوس! دنیا کی نابینائی اور بے انصافی آج معاملہ کو برعکس کرتی، احسان فراموش خلقت احسان کو جرم بناتی، اور ناکردہ گناہ بلکہ محسن ہستی کو گناہگار بنا کر اپنی جفاکیشی کو جوش انتقام کے پردہ میں چھپانا چاہتی ہے۔

ابن زیاد کا غصہ فقط افواج کا سیلاب کربلا کی سمت روانہ کر دینے پر نہیں تھا۔ اُس نے عمر سعد کو خط لکھا کہ حسینؑ اور اُن کے اصحاب پر پانی بند کر دو۔ اور انھیں ایک قطرہ بھی

پانی کا نہ ملے۔ جیسا کہ مظلوم خلیفہ عثمان بن عفان کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا[1]

عمر سعد نے اس خط کے دیکھتے ہی عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچ سو سواروں کی فوج کے ساتھ گھاٹ پر مقرر کر دیا کہ ایک قطرہ پانی کا حسینؑ اور اصحاب حسینؑ تک پہونچنے نہ پائے۔ تاریخ میں تصریح ہے کہ

ذٰلک قبل مقتلہ بثلاثۃ ایام۔ "یہ امام حسینؑ کی شہادت سے تین روز قبل کا واقعہ ہے"۔

(الاخبار الطوال ص۲۵۳، طبری ج ۶ ص۲۳۴)

اب حسینؑ، اصحاب و انصار، سراپردۂ عصمت کی بیبیاں اور چھوٹے چھوٹے بچے۔ عرب کا ریگستان ہے، اور تپتی ہوئی ریگ کے ذرّے۔ پانی نایاب ہے اور پیاس کی طغیانی۔ اُس پر زبان کے زخم۔ عبد اللہ بن ابی حصین ازدی قبیلۂ بجیلہ کا ایک شخص فوج عمر سعد سے باہر آتا، پکار کر کہتا ہے۔

یا حسین الا تنظر الی الماء کانّہ کبد السماء واللہ لا تذوق منہ قطرۃ حتیٰ تموت عطشا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۳۴، الاخبار الطوال ص۲۵۳۔ اصلی عبارت اور دونوں کتابوں کے الفاظ میں جو جزئی تفرقہ ہے اور اس خط سے جو بعض نتائج برآمد ہوتے ہیں
اُن کے لیے ملاحظہ ہو "قاتلان حسینؑ کا مذہب"

"اے حسینؑ! یہ پانی نہیں دیکھتے، کس طرح نیلا نیلا آسمانی رنگ کا بہہ رہا ہے مگر بخدا تمھیں اس میں سے ایک قطرہ نہیں ملے گا جب تک کہ پیاس سے تم ہلاک نہ ہو جاؤ۔"

یہ مقامات غیرت الٰہی کے جنبش میں آنے کے ہیں۔ حسینؑ کا روحانی اقتدار ایسی جگہوں پر مصروف عمل ہو گیا ہے۔

امامؑ نے سر اُٹھایا آسمان کی طرف اور کہا۔ اللّٰھم اقتلہ عطشا ولا تغفر لہ ابدا۔ "خداوندا! اسے پیاس سے ہلاک کر اور اس کی کبھی مغفرت نہ فرما۔"

دیکھنے والے اس دعا کی قبولیت کے گواہ ہیں۔ وہ شقی پانی پیتا تھا اور کسی طرح سیراب نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ہلاک ہو گیا۔ (طبری ج ۶ ص ۲۳۴)

---

۱۳ تیرھواں باب

صلح کی دوبارہ گفتگو

عمر سعد کے سابقہ طرز عمل اور گذشتہ حالات سے یہ پتہ ضرور چل گیا ہے کہ وہ اپنے دل سے حسینؑ سے جنگ کا طالب نہیں ہے، لیکن طمع دنیا اس کے پیچھے ہٹتے ہوئے قدموں کو پھر

آگے بڑھا دیتی ہے اور وہ صحیح راستے پر آتے آتے بھٹک جاتا ہے۔ ایسی صورت میں لطف الٰہی کے تحت میں ایک داعی حق پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے جذبۂ حق پسندی کو تقویت دینے کی جو امکانی تحریک ہو اُس میں دریغ نہ کرے، اور پھر جب کہ امن پسندی کا تقاضا بھی ایسی امکانی کوشش کو ضروری قرار دیتا ہے۔ جس میں حمایت باطل کا پہلو پیدا ہوئے بغیر جنگ و جدل کی آگ فرد ہو، اور خون ریزی تک نوبت نہ پہونچے۔

امام حسینؑ کا طرز عمل ابتدا ہی سے روادارانہ تھا اور اسی رواداری کا نتیجہ تھا کہ آپ نے خود اپنی جانب سے عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری کو عمر سعد کے پاس بھیجا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کے لشکروں کے درمیان میں مل لینا۔"

عمر سعد کوئی بیس سوار اپنے ساتھ لے کر نکلا، اور امامؑ بھی اتنے ہی ساتھیوں کی معیت میں تشریف لے گئے۔ لیکن جب قریب پہونچے، حضرت نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم علیحدہ ہو جاؤ۔ جس کے بعد عمر سعد نے بھی اپنے ساتھیوں کو ہٹا دیا۔

راوی کا بیان ہے کہ ہم لوگ سب ہٹ گئے اس طرح کہ نہ ہمیں بات چیت کی آواز معلوم ہوتی تھی، نہ کوئی بات سمجھ میں آتی تھی۔ گفتگو بڑے رات گئے تک ہوئی اور اس کے بعد دونوں آدمی اپنے اپنے لشکرگاہ کی طرف واپس گئے۔

گفتگو صیغۂ راز میں تھی، مگر لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنا ڈالیں۔ یزید کے ہوا خواہوں نے کہا کہ امام حسینؑ نے عمر سعد سے خواہش کی کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو، میں اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ حضرت نے کبھی اپنی زبان سے نہیں فرمایا کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو۔

جس بات پر راویوں کا پورے طور سے اتفاق ہے، وہ یہ کہ حضرت نے فرمایا مجھے کسی دور سرزمین پر چلا جانے دو، یہاں تک کہ مسلمان میری عدم موجودگی میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرلیں، اور یکسوئی حاصل ہو جائے۔

یہ مشہور روایت کہ حضرت نے ہندوستان آنے کی خواہش فرمائی تھی۔ شاید اسی قدر واقعیت پر مبنی ہے۔

عمر سعد کو پورے طور سے احساس ہو گیا کہ حضرت کا طرز عمل صلح پسندانہ ہے، اُس نے ابن زیاد کو خط لکھا، اور واقعہ سے اطلاع دی، امام حسینؑ کے مطالبات ذکر کیے اور اپنی رائے بھی لکھ دی کہ فی ھذا الکم رضا وللامۃ صلاح۔

"اس مطالبہ کے پورا کرنے پر آپ کو رضامند ہونا چاہیئے اور مسلمانوں کی بھی بہتری ہے۔"

اُس نے اس صورت حال کو فال نیک اور نشان صلح و

سکون بھی سمجھا کہ اُس نے تحریر کیا۔ ان اللّٰہ قد اطفأ النائرۃ وجمع الکلمۃ واصلح امر الامۃ۔

"شکر ہے خدا کا کہ اُس نے آگ خاموش کی اور شیرازہ متحد کیا اور مسلمانوں کے امر کی اصلاح کر دی۔" خط ابن زیاد کے پاس پہونچا اور اُس پر بھی وقتی طور پر خوشگوار اثر پڑا، اُس نے کہا ھذا کتاب رجل ناصح لامیرہ مشفق علیٰ قومہ نعم قد قبلت

"یہ خط ہے ایک ایسے انسان کا جو اپنے امیر کا خیرخواہ اور اپنی قوم کا خیر اندیش معلوم ہوتا ہے۔ بے شک مجھے منظور ہے۔" مگر کج فطرت اور پست نہاد شمر برافروختہ ہو گیا، اُس نے کھڑے ہو کر کہا، "اب جب کہ وہ آپ کے حدود سلطنت میں اور آپ کی سرزمین پر آگئے ہیں آپ انھیں موقع دیتے ہیں، اور اُن کی یہ خواہش منظور کیے لیتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر آج وہ چلے گئے اور آپ کے قابو میں نہ آئے تو یاد رکھیے کہ قوت اور عزت اُن کا حصہ ہو گی، اور ضعف و کمزوری آپ کا حق۔ آپ ہرگز انھیں ایسا موقع نہ دیجیے یہ آپ کی بڑی کمزوری ہو گی۔"

بے شک انھیں چاہیے کہ وہ اور اُن کے اصحاب اپنے کو آپ کے حوالے کر دیں۔ جس کے بعد اگر آپ سزا دیں تو بے شک آپ کو اختیار ہے، اور اگر معاف کرنا چاہیں تو آپ کی مہربانی ہے۔ رہ گیا عمر بن سعد اُس کا کیا ذکر۔ مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ رات رات بھر

دونوں لشکروں کے درمیان اُس سے اور حسینؑ سے باتیں ہوتی رہتی ہیں۔"

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، مفسدانہ وفتنہ پردازانہ تقریر تھی جس سے ایک طرف تفوق طلبی و ظفرانجامی کے جذبہ کو حرکت پیدا ہوئی، اور دوسری طرف انانیت اور غرور خودی کی رگ میں جنبش ہوئی، تیسری طرف ابن سعد کی جانب سے بدگمانی ہوگئی اور وہ خلوص و صداقت کا اثر جو اُس کی تحریر سے پڑا تھا رخصت ہوگیا۔ شمر بڑا خیرخواہ دوست اور سچا مشیر کار معلوم ہوا۔ عمر بن سعد پر غصہ آیا کہ وہ لڑنے گیا ہے، رات رات بھر بیٹھ کر دشمن سے ——— باتیں کرتا ہے۔ حسینؑ سے مل گیا ہے۔ ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے۔

پھر ایسے مشتبہ شخص کا سردار لشکر ہونا کیسا۔ یقیناً شمر کو کربلا بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے طرز عمل کا تدارک ہو اور حسینؑ کے ساتھ ہر قسم کی صلح پسندانہ گفتگو کا سدباب ہو۔

ابن زیاد نے اسی غصہ کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا:

اما بعد فانی لم ابعثک الی حسین لتکف عنه ولا لتطاوله ولا لتمنیه السلامة والبقاء ولا لتقعد له عندی شافعا انظر فان نزل حسین واصحابه علی الحکم واستسلموا فابعث بهم الیّ سلما وان ابوا فازحف الیهم حتی تقتلهم

وتمثل بھم فانھم لذلک مستحقون فان قتل حسین فاوطی الخیل صدرہ وظھرہ فانی عاق مشاق قاطع ظلوم ولیس دھری فی ھذا ان یضر بعد الموت شیئاً و لکن علیٰ قول لو قد قتلتہ فعلت ھذا بہ ان انت مضیت لامرنا فیہ جزیناک جزاء السامع المطیع وان ابیت فاعتزل عملنا وجندنا وخل بین شمر بن ذی الجوشن وبین العسکر فانا قد امرناہ بامرنا۔

"میں نے تم کو حسینؑ کی جانب اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم اُن کے ساتھ مراعات کرو یا اُن کے ساتھ معاملات کو طول دو، یا اُن کو زندگی کی اُمیدیں دلاؤ، یا میرے پاس اُن کی سفارش کرنے بیٹھو۔ دیکھ اگر حسینؑ اور ان کے اصحاب میرے حکم پر سر تسلیم خم کریں اور اپنے کو میرے رحم و کرم کے سپرد کریں تو اُن کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو، اور اگر وہ انکار کریں تو اُن پر حملہ کر دو، یہاں تک کہ انھیں قتل کر ڈالو اور اُن کے اعضاء کو قطع کر دو کیونکہ وہ لوگ اسی کے مستحق ہیں۔"

وحشت کی انتہا اور درندگی کی حد ہے۔ اسلام کا نام بدنام کرنے والے۔ انسانیت کی پیشانی عرق انفعال سے تر کرنے والے۔ تاریخ کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں قرار دینے والے الفاظ یہ ہیں، جو کسی اور کی نسبت نہیں، رسولؐ کے سب سے

پیارے نواسے حسینؑ کی نسبت لکھے جا رہے ہیں۔

وہ قلم شگافتہ نہ ہوگیا، وہ روشنائی خشک نہ ہوگئی۔ وہ ہاتھ بیکار نہ ہوگیا جس سے صفحہٴ کاغذ پر ان الفاظ کی سیاہی پھیل رہی تھی کہ "اگر حسینؑ قتل ہوجائیں تو اُن کے سینہ اور پشت کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرانا، کیونکہ وہ سلطنت کے باغی، مخالف اور حریف ہیں۔

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے موت کے بعد اُن کو کوئی نقصان پہونچے گا لیکن میں یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسینؑ کو قتل کروں تو اُن کے ساتھ یہ سلوک کروں گا۔

اگر تم نے ان احکام کا اجرا کیا تو خیر، تمھیں معاوضہ ملے گا جو ایک وفادار فرماں بردار کو ملنا چاہیے، اور اگر تمھیں یہ منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہوجاؤ اور اُسے شمر کے سپرد کردو۔ جیسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کردی ہیں"

یہ خط شمر کے حوالہ کیا اور اُس سے زبانی کہہ دیا کہ یہ خط عمر سعد کے پاس لے جاؤ، اُس سے کہو کہ وہ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے سامنے میرے حکم کی پابندی کا سوال پیش کرے۔ اگر وہ لوگ اس پر آمادہ ہوں تو انھیں خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو، اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو اُن سے جنگ کرو۔

درصورتیکہ عمر سعد ایسا کرنے پر آمادہ ہو تو تم اُس کی ماتحتی میں رہنا، اور اُس کے احکام پر عمل کرنا، اور اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرے تو تم سرداری لشکر کو اُس کے ہاتھ سے لے لینا، اور تم خود بحیثیت سردار اُن لوگوں سے جنگ کرنا، اور عمر سعد کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دینا۔"

شمر نے خط لیا اور کربلا کی سمت روانہ ہوا۔

چودھواں باب

نویں تاریخ کی سہ پہر

ابن زیاد کا خط شمر کے ہاتھ عمر سعد کو پہونچ گیا۔ وہ خط کو دیکھتے ہی واقعہ کی تہ تک پہونچ گیا۔ سمجھ گیا کہ شمر کی شرارت تھی۔ کہنے لگا۔

مالک ویلک لاقرب اللہ دارک و قبح اللہ ما قدمت بہ علی واللہ انی لاظنک انت ثنیتہ ان یقبل ما کتبت بہ الیہ افسدت علینا امرا کنا رجونا ان یصلح لا یستسلم واللہ حسین ان نفسا ابیۃ لبین جنبیہ۔

"یہ تونے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور برا کرے اس پیغام کا جو تو میرے پاس لایا ہے۔ خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ تو ہی نے ابن زیاد کو میرے مشورہ کے قبول کرنے سے روک دیا۔ تونے بگاڑ دیا ایک ایسی بات کو جس کے بن جانے کی مجھ کو امید تھی خدا کی قسم حسینؑ ہرگز اپنے کو ابن زیاد کے سپرد نہ کریں گے۔ حسینؑ اپنے سینہ میں ایک غیور دل رکھتے ہیں"

کیا کہنا اس اباے نفس۔ اس شہامت طبع۔ اس آن بان اور اس غیرت حق کا جس کے لیے ایک مخالف کی زبان اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

شمر نے کہا ان باتوں کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ امیر کے حکم پر عمل کرو گے، اور دشمن سے جنگ کرو گے یا سرداری لشکر کی میرے سپرد کرو گے؟

کمزور دل والا انسان، دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اس وقت بھول جاتا تھا جب دنیا کے وقتی راحت و آرام اور جاہ و ثروت کے ہاتھ سے چلے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا۔ وہ دنیا کے عشق میں اس وقت اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کردینے پر تیار ہو جاتا تھا، جس میں اس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔

خطرہ بالکل نقد تھا۔ اور اپنا رقیب عشق سرداری (شمر بن ذی الجوشن)

سامنے موجود تھا، اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب تھا جس پر تمام فیصلہ کی بنیاد تھی۔

جس کے ساتھ فقط سرداری رہنے اور نہ رہنے کا سوال ہی نہ تھا بلکہ جیسا ابن زیاد کی گذشتہ تقریر سے معلوم ہوا، جان کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔ مخالفت کی صورت میں قتل کا سامان مہیا تھا۔ اس کے لیے تو بے شک ویسے ہی جذبۂ حق پسندی کی ضرورت تھی جو فداکاران راہ حقانیت کو ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ کر سکتا ہے۔

عمر سعد اس جذبہ سے عاری اور ثبات و استقلال کے وادی سے اجنبی تھا۔ شمر کے اس سوال پر اس کو کہہ دینا پڑا کہ "نہیں میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا۔"

شمر کا وجود عمر سعد کے لیے سوہان روح تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی اپنی نسبت بالکل ظاہر ہو چکی تھی۔ اب اُسے اپنی وفاداری اور اخلاص مندی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ اس لیے اب جنگ میں تھوڑی بھی تاخیر اُس کو منظور نہیں تھی۔

بے شک شمر کو ابھی لشکر امام حسینؑ میں اپنے ایک مقصد کی کوشش اور ایک امر کی ریشہ دوانی کرنا تھی۔ جس کی اُس نے کوفہ سے چلتے وقت ہی تدبیر کر لی تھی۔

امام حسینؑ کے وفادار بھائی ابوالفضل العباسؑ کی والدہ معظمہ ام البنین تھیں جن کا اصلی نام و نسب فاطمہ بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن عامر بن کلاب

اور شمر جس کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، شمر بن ذی الجوشن شر جلیل بن اعور قرط بن عمرو بن معاویہ بن کلاب ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جناب ام البنین قوم و قبیلہ کے اعتبار سے شمر کے ساتھ قرابت رکھتی تھیں، اور شمر جناب عباس اور اُن کے حقیقی بھائیوں کو رشتہ کے لحاظ سے اپنا بھانجا خیال کرتا تھا۔

اُس نے کوفہ سے چلتے وقت ابن زیاد کی جانب سے حضرت عباس اور اُن کے بھائیوں کے لیے ایک تحریری اماں لکھوالی تھی جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

اب کربلا میں پہونچ کر عمر سعد کی گفتگو کے بعد وہ فوج حسینی کے مقابل آیا، اور پکار کر کہا، این بنوا ختنا۔ "کہاں ہیں ہماری بہن کے بیٹے۔" حضرت عباس، جعفر و عثمان و عبد اللہ چاروں بھائی سامنے آئے اور پوچھا کیا ہے؟ کیوں پکارتے ہو؟ شمر نے کہا "تم اے میری بہن کے فرزندو! اماں میں ہو۔"

چاروں جوانوں نے پکار کر کہا۔ لعنک اللہ و لعن امانک لئن کنت خالنا اتؤمننا و ابن رسول اللہ لا امان لہ۔

"لعنت خدا کی تجھ پر اور تیری امان پر۔ تو ہمارا ماموں سہی۔ مگر یہ کیا کہ ہم کو تو اماں ہے، اور فرزند رسول صلعم کو اماں نہیں ہے۔"

ایسا ہی دوسرا واقعہ اور پیش آیا کہ عبد اللہ بن ابی المحل بن حزام نے، جو جناب ام البنین کا حقیقی بھتیجا تھا۔ ابن زیاد کے پاس جا کر کہا

کہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی حسینؑ کے لشکر میں ہیں، اُن کے لیے امان
تحریر کردی جائے۔ ابن زیاد نے کہا "ہاں بسر و چشم"۔ اور اپنے
کاتب سے امان لکھوادی۔ عبداللہ نے اپنے غلام "کرمان" کے ہاتھ
اُس امان نامہ کو روانہ کیا۔ جب وہ کربلا آیا تو اُس نے جناب
عباسؑ اور اُن کے تینوں بھائیوں کو اُس امان سے مطلع کیا۔
چاروں بھائیوں نے اُس تحریر کو واپس کیا۔ کہا ہمارا اسلام کہنا
اور کہہ دینا کہ ہم کو تمھاری امان کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا
کے یہاں کی امان ہمارے لیے بہتر ہے۔ ابن زیاد کی امان سے
یہ واقعہ عام طور سے مشہور نہیں ہے۔ لیکن تاریخ میں معتبر
طور سے موجود ہے۔ (طبری ج ۷ ص ۲۳۶)

نویں تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ عمر سعد نے جنگ
کی تیاری کر دی اور امام حسینؑ پر حملہ کا حکم دے دیا۔
امام حسینؑ عصر کی نماز کے بعد خیمہ مبارک کے دروازہ پر تلوار کا
سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ نیند غالب
ہوگئی تھی۔

اچانک ایک مرتبہ دشمن کی فوج نے حملہ کر دیا۔ گھوڑوں کی
ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینبؑ کے کان میں گئی۔ آپ
امام حسینؑ کے قریب آئیں اور کہا "بھائی! بھائی، دیکھیے دشمن کے
لشکر کی آوازیں بہت قریب سے آرہی ہیں"۔ حضرت نے سر اٹھایا

فرمایا میں نے ابھی رسالتمآبؐ کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرماتے ہیں تم عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتے ہو!

حملہ آور لشکر کے شور و غل سے جناب زینبؑ کا دل دہلا ہوا تھا ہی۔ اب جو بھائی نے یہ خواب بیان کر دیا تو زینبؑ کی آنکھوں میں نہ معلوم کون منظر گردش کرنے لگا۔ کرتیں کیا؟ بس ایک دفعہ چہرہ پر اپنے دو ہتڑ لگایا اور کہا یا ویلتا۔ "ارے غضب"!

امامؑ نے تسکین دی اور فرمایا لیس لک الویل یا اخیۃ اسکنی رحمک الرحمٰن۔ "غضب تمہارے دشمنوں کے لیے اے بہن خاموش رہو۔ خدا تم پر رحم کرے"۔

اتنی دیر میں جناب عباسؑ بھی پہونچ گیے، کہا یا اخی اتاک القوم "بھیا لشکر آگیا"! حضرت یہ سُن کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوے۔ محبت آمیز انداز میں فرمایا۔ یا عباس ارکب بنفسی انت یا اخی حتی تلقاھم فتقول لھم ما لکم وما بدا لکم وتسألھم عما جاء بہ۔

"اے عباسؑ! میں قربان تم پر اے میرے بھائی سوار ہو اور ان کے پاس جاؤ اُن سے پوچھو کہ آخر یہ کیا ہے اور ان کی رائے میں کیا تبدیلی ہوئی؟ اور اس بے وقت حملہ کا کیا سبب ہے؟"

جناب عباسؑ بیس سوار دل کے ساتھ تشریف لے گئے۔ غالباً اصحاب نے حضرت کو جاتے دیکھ کر خود ہی تنہا جانا گوارا نہ کیا ہوگا اور گھوڑے

بڑھا دیئے ہوں گے۔ آپ نے جا کر دریافت کیا۔ ما بدا لکم و ما تریدون۔ تمہارے رائے میں کیا تبدیلی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کریں اور نہیں تو تم سے جنگ کی جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر تم جلدی نہ کرو۔ میں امامؑ کے پاس جا کر تمہارا یہ جواب عرض کر دوں۔ جناب عباسؑ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسینؑ کی خدمت میں گئے کہ آپ کو واقعہ سے اطلاع دیں۔ اصحاب جو ساتھ گئے تھے وہ دشمن کے مقابل کھڑے رہے اور موقع کو غنیمت سمجھ کر چاہا کہ کچھ تبلیغ ہی کے فرض کو انجام دیں۔ حبیب بن مظاہر، زہیر بن قین کی طرف متوجہ ہوئے، اور کہا دل چاہے تو کچھ ان لوگوں سے گفتگو کرو۔ نہیں ہو تو میں کچھ کلام کر دوں۔ زہیر نے کہا ابتداء اس خیال کی آپ نے کی، تو آپ ہی کلام بھی کیجئے"۔

حبیب متوجہ ہوئے فوج مخالف کی طرف اور اس طرح تقریر کرنا شروع کی:

اما واللہ لبئس القوم عند اللہ غداً قوم یقدمون علیہ قد قتلوا ذریۃ نبیہ وعترتہ واھل بیتہ وعبّاد اھل ھذا المصر المتھجدین بالاسحار والذاکرین اللہ کثیرا۔

"یاد رہے کہ بڑی بُری ہوگی خدا کے

سامنا کرے گی اس حالت میں کہ اُس کے نبی کی ذرّیت اور اہلبیت کو اُس نے قتل کیا ہو اور اس ملک کے اُن عبادت گذاروں کا خون بہایا ہو، جو پچھلے پہر خدا کی عبادت کرنے والے اور ذکر الٰہی میں کثرت سے مصروف رہنے والے ہیں"۔

عزرہ بن قیس احمسی جو فوج مخالف میں تھا، اُس نے بات کاٹنے کے لیے مذاق کے طور پر کہا "حبیب! جہاں تک ہو سکتا ہے تم اپنی تعریف اور اپنے نفس کی پاکیزگی کا اظہار ضرور کرتے ہو"۔

زہیر نے جواب دیا "اے عزرہ خدا ہی نے اُن کے نفس کو پاکیزہ کیا ہے۔ اور اُس کو راہ راست کی طرف ہدایت کی ہے"۔

زہیر کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ یہ پہلے علیؑ اور اولاد علیؑ سے کوئی خاص تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ شام والوں کے ہمخیال تھے اور اس لیے عثمانی جماعت میں مشہور و معروف تھے۔ مکہ معظمہ و کربلا کے درمیانی راستے میں ایک منزل پر امام حسینؑ نے ان سے ملاقات کر کے اپنی نصرت کی دعوت دی۔ توفیق شامل حال ہوئی اور قسمت نے یاوری کی۔ دل میں محبت اہلبیتؑ پیدا ہوئی اور یہ جان و دل سے حسینؑ پر نثار ہونے کو تیار ہو گئے۔

یہی باعث تھا کہ اس وقت زہیر کی آواز جو انصار حسینؑ کے درمیان بلند ہوئی تو مخالف فوج کے لوگوں کو تعجب ہو گیا اور عزرہ بن قیس نے مڑ کر زہیر کی طرف نظر ڈالی اور کہا:

يا زهير ما كنت عندنا من شيعة اهل هذا البيت
انّما كنت عثمانيا۔

" اے زہیر تم ہو۔ تم تو ہماری دانست میں اس خاندان کے
شیعوں میں سے نہ تھے، بلکہ عثمانی مذہب رکھتے تھے"۔

زہیر نے کہا۔ افلا تستدل بموقفی هذا انّی منهم
اما واللّٰه ما کتبت الیه کتابا قط ولا ارسلت الیه
رسولاً قطّ ولا وعدته نصرتی قط ولکن الطریق جمع
بینی وبینه فلمّا رأیته ذکرت به رسول اللّٰه و
مکانه منه وعرفت ما یقدم علیه من عدوّه وحزبکم
فرأیت ان انصره وان اکون فی حزبه وان اجعل
نفسی دون نفسه حفظا لما ضیّعتم من حق اللّٰه وحق
رسوله علیه السّلام۔

" اب تو تم میرے یہاں ہونے سے سمجھے کہ میں شیعیانِ اہلبیتؑ
میں سے ہوں۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کی قسم میں نے
امام حسینؑ کو کبھی خط نہیں لکھا تھا اور نہ کوئی قاصد روانہ کیا
تھا، نہ کبھی نصرت کا وعدہ کیا تھا لیکن راستے میں اتفاق سے
مجھ سے اور اُن سے ملاقات ہو گئی، اور جب میں نے انھیں دیکھا
تو مجھے رسالتمآبؐ اور وہ تعلق جو ان کو اُن سے تھا یاد آگیا
اور مجھے معلوم ہوا کہ

جا رہے ہیں۔ تو میں نے اچھا سمجھا کہ میں ان کی نصرت کروں اور ان کی جماعت میں داخل ہوں اور اپنی جان کو ان پر نثار کروں۔ حفاظت کرتے ہوئے خدا ؑ ور رسولؐ کے اُن حقوق کی جن کو تم نے ضائع کردیا ہے۔"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ جناب عباسؑ آگئے اور فرمایا کہ "امامؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی ہے، صبح کو دیکھا جائے گا۔"

عمر سعد شمر کی موجودگی کو اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا اس لیے اب وہ امام حسینؑ کے معاملہ میں ہر امر میں خواہ مخواہ کے لیے بھی تشدد سے کام لیتا تھا۔ اُسے برابر شمر کی ذات سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "کہو تمہاری کیا رائے ہے؟"

اُس نے کہا "جو آپ کی رائے۔ حاکم آپ ہیں اور معتبر آپ کی رائے ہے۔" عمر سعد نے کہا "میں تو چاہتا ہوں کہ مہلت نہ دی جائے۔" پھر وہ دوسرے سرداران لشکر کی طرف متوجہ ہوا "کیوں تمہاری کیا رائے ہے؟" عمرو بن حجاج زبیدی نے کہا:

سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلہ ترک و دیلم کے بھی ہوتے اور اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو تمھیں اُن کے ساتھ یہ مراعات کرنا لازم تھی۔" قیس بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مہلت دینا چاہیے۔

آخر ایک شب کی مہلت مل گئی اور بڑھی ہوئی حملہ آور

فوج پیچھے واپس گئی۔

پندرھواں باب

عاشور کی رات

یہ ماہ زہرا کے عمر کی دنیا میں آخری شب ہے۔ اس شب کی مہلت اتنی کوشش کے ساتھ رسولؐ کے فرزند نے مانگ کر لی ہے۔ ظاہر بیں اشخاص کی سمجھ میں آتا ہوگا کہ حسینؑ کوئی لڑائی کی تیاری کرنا چاہتے ہیں۔ کسی پہونچنے والی امداد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنے اہلبیتؑ اور عزیز پردگیان عصمت کو دل بھر کر دیکھ لینا اور رخصت کر لینا چاہتے ہیں۔ یا اپنے بعد کے واسطے اُن کے لیے کچھ انتظامات کرنا منظور ہیں، اور انھیں کسی کے سپرد کرنا مدنظر ہے۔ یا کچھ نہیں تو کم از کم کچھ وصیتیں کریں گے، اور اپنے بعد کے واسطے ہدایت فرمائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کچھ بھی نہ تھا۔ آپ نے اپنی مہلت مانگنے کا سبب اُسی وقت جب جناب عباسؑ کو مہلت لینے کے لیے بھیجا ہے، ظاہر کر دیا تھا، آپ نے فرمایا تھا:

لعلنا نصلّی لربنا اللیلۃ و ندعوہ و نستغفرہ فھو یعلم انی قد کنت احبّ الصّلوٰۃ و تلاوۃ کتابہ و کثرۃ الدّعآء والا ستغفار۔

"ہم آج کی رات اپنے پروردگار کی خوب عبادت کرلیں، اور دعاؤ استغفار میں مصروف رہیں، کیونکہ خدا خوب واقف ہے کہ میں ہمیشہ سے اُس کی عبادت اور تلاوت قرآن اور کثرت دعاؤ استغفار کو محبوب سمجھتا رہا ہوں۔" (طبری ج ۶ ص ۲۳۸ مطبوعہ مصر)

ایسا ہی ہوا۔ ضحاک بن عبداللہ مشرقی کا بیان ہے۔

قاموا اللّیل کلّہ یصلّون ویستغفرون ویدعون ویتضرعون۔ "تمام شب گذاری اس طرح کہ نماز اور دعا اور استغفار اور تضرّع میں مصروف تھے۔" (طبری ج ۶ ص ۲۴۰)

بے شک ابتدائے شب حضرت نے اپنے اصحاب کو جمع کیا۔ شاید تدابیر جنگ کے متعلق مشورہ کے لیے؟ مگر نہیں بلکہ نتیجہ سے مطلع کرکے اُن کو اختیار دینے کے لیے کہ وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔

یہ ہیں "مجاہد کربلا" کی حقانیت و صداقت کے اصلی خط و خال۔

یہ ہے "مجاہد کربلا" کی اصلی آن بان، اور حقیقی استغنا کی شان۔

وہ دل لبھانے والی تقریروں سے، جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات سے، خوش آیند اُمیدوں کے سبز باغ سے اور دل فریب توقعات کے سراب خیال سے اپنے ساتھ والوں کو گرویدہ بنانے کی

کوشش نہیں کر رہے تھے، بلکہ اُن کے سامنے حقیقت حال کو واضح کر کے غلط فہمیوں کے پردہ کو چاک کر دینا چاہتے تھے۔

ہمارے سامنے ہیں بڑے بڑے افراد کے حالات اور اُن کے منتسبین کے طرز عمل۔ ہمارے سامنے ہیں انجیل کے بیانات جن میں حضرت یسوع مسیح کا اپنے شاگردوں سے اپنی گرفتاری اور سولی پر چڑھائے جانے کا واقعہ بیان کرنا مذکور ہے۔ ہمارے پیش نظر ہے یہ صورت کہ یسوع مسیح کو اُنہی شاگردوں میں سے ایک آدمی پکڑوا دیتا ہے، جسے وہ پہلے سے بتلا بھی چکے ہوتے ہیں اور دوسرے شاگردوں کی نسبت وہ صاف طور سے کہہ بھی دیتے ہیں کہ تم سب اس رات میری بابت ٹھوکر کھاؤ گے۔ اور اُن کے سب سے مخصوص ساتھی پطرس یہ کہتے ہیں کہ سب آپ کی نسبت ٹھوکر کھائیں مگر میں تو ٹھوکر نہ کھاؤں گا، اور یسوع خبر دیتے ہیں کہ نہیں۔ مُرغوں کے اذان دینے سے پہلے تم تین بار میرا انکار کرو گے! پطرس نے عہد کیا کہ اگر آپ کے ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی آپ کا انکار ہرگز نہ کروں گا۔ اور سب شاگردوں نے بھی یہی کہا۔" مگر وقت پر کیا ہوا؟ وہی کہ سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ پطرس نے تین مرتبہ عیسیٰ کے ساتھ ہونے سے انکار کیا، بلکہ اُن پر لعنت بھی کی اور اپنی جان بچائی۔"

(ملاحظہ ہو انجیل متی باب ۲۶ مرقس ۱۴ لوقاب ۲۲ لوحنا ۱۸)

ہمارے سامنے ہیں رسالتمآبؐ کے اصحاب کی وفاداریاں اور جنگ اُحد میں اُن کا عالم، اور ہمارے پیش نظر ہے امیرالمومنینؑ کے ساتھیوں کا عالم بھی جن کی نسبت آپ یہ فرماتے تھے کہ

قد شحنتم صدری غیظا و ملأتم قلبی قیحا۔

"تم نے میرے سینہ کو غم و غصّہ سے بھر دیا اور میرے دل کو پیپ کر دیا"۔

یقیناً ان تمام کے مقابلہ میں جب حسین بن علیؑ کے اصحاب کو پیش کرتے ہیں تو وفا کے مجسّمے، ثبات و استقلال کے مرقعے، بات پر مٹنے کے نمونے، اور اپنے امام کی صحیح اطاعت و معرفت کے بے نظیر نقشے نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

امامؑ نے اصحاب کو جمع کیا۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ میں بیمار تھا مگر قریب چلا گیا کہ سنوں! حضرت کیا فرماتے ہیں۔

حضرت نے حمد و ثنائے الٰہی ادا فرمائی۔ پھر فرمایا:

انی لا اعلم اصحابا اولیٰ و لا خیرا من اصحابی و لا اھل بیت ابرّ و لا اوصل من اھل بیتی فجزاکم اللہ عنی جمیعا خیرا الا و انی اظنّ یومنا من ھؤلاء الاعداء غدا الا و انّی قد رأیت لکم فانطلقوا جمیعا فی حلّ، لیس علیکم منّی ذمام ھذا اللّیل قد غشیکم فاتخذوہ جملا۔

"مجھے خبر نہیں دنیا میں کسی کے اصحاب میرے اصحاب سے بہتر اور زیادہ وفادار ہوں، اور نہ کسی کے عزیزوں کو جانتا ہوں کہ میرے عزیزوں سے زیادہ حق شناس اور مطیع و فرماں بردار ہوں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے نیک بدلا دے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ میرے خیال میں ہماری قسمت کے فیصلہ کا ان لوگوں کے ساتھ کل کا دن ہے۔ میں نے تم لوگوں کے متعلق غور کیا۔ میری رائے تم لوگوں کی نسبت یہ قائم ہوئی کہ تم سب نے سب چلے جاؤ بالکل خوشی کے ساتھ۔ میری جانب سے تم پر کوئی ذمّہ داری عائد نہیں ہے۔ دیکھو یہ رات کی تاریکی موجود ہے، اسے تم اپنا ذریعۂ نجات قرار دو۔ اور اسی کے سہارے پر یہاں سے جلدی نکل جاؤ۔"

اصحاب کے دلوں پر غیریّت کا اثر نہ پڑنے کی خاطر یہ بھی فرمایا کر لیا خذ کلّ رجل منکم بید رجل من اهل بیتی ثمّ تفرّقوا فی سوادکم ومدائنکم حتی یفرج اللّٰه فان القوم انما یطلبونی ولو قد اصابونی لهوا عن طلب غیری۔

"ہر شخص تم میں سے ایک ایک شخص کا میرے عزیزوں سے بھی ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ساتھ لیتا جائے، اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں۔ اگر مجھے قتل کر ڈالیں تو پھر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔"

یہ سُننا تھا کہ مجمع میں ایک بے چینی پیدا ہو گئی۔ بھائی، بیٹے، بھتیجے اور عبداللہ بن جعفر کے دونوں صاحبزادے بیک زبان پکار اُٹھے کو لم نفعل لنبقی لبعدک لا ارانا اللہ ذلک ابدا۔ "یہ کیوں؟ کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں۔ ہرگز نہیں! خدا ہم کو یہ روز بدنصیب نہ کرے"۔

ان میں سب سے پہلے اس قول کے کہنے والے حضرت ابوالفضل العباسؑ تھے جن کے بعد دوسرے جوان اور نوجوان بھی آپ کے ہم آواز ہوئے تھے۔

امامؑ متوجہ ہوئے اولادِ عقیل کی طرف، فرمایا "تمھارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکنا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ میں تمھیں اجازت دیتا ہوں"۔ انھوں نے کہا:

"لوگ ہمیں کیا کہیں گے کہ ہم نے اپنے سردار و آقا اور اپنے بھائیوں، چچاؤں کو چھوڑ دیا اور اُن کے ساتھ نہ کوئی تیر لگایا، نہ نیزہ مارا، اور نہ شمشیر سے جنگ کی، بلکہ خبر بھی نہ لی کہ اُن پر کیا گذری۔ ہرگز ہم ایسا نہیں کریں گے بلکہ آپ پر اپنی جانیں نثار کریں گے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں ہے"۔

ابھی تک اعزہ کلام کر رہے تھے۔ اصحاب ادب سے خاموش تھے۔ اب مسلم بن عوسجہ اسدی کھڑے ہوئے، کبیرالسن تھے مگر الفاظ میں وہ زور، وہ جوش و طاقت کہ جوان مردوں کے دل

مرعوب اور دہشت سے خوفزدہ ہو جائیں، رُخ کیا امامؑ کی طرف اور کہنے لگے۔ انحن نخلّی عنک ولمّا نعذر الی اللّٰہ فی اداء حقّک اما واللّٰہ حتّیٰ اکسر فی صدورھم رمحی واضربھم بسیفی ما ثبت قائمہ فی یدی ولا افارقک ولو لم یکن معی سلاح اقاتلھم بہ لقذفتھم بالحجارۃ دونک حتّیٰ اموت معک۔

"ہم آپ کو چھوڑ دیں بغیر اس کے کہ خدا کے یہاں آپ کے حق کو ادا کر کے جواب دہی کا سامان کریں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ ان کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار لگاؤں گا جب تک کہ اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح جدا نہ ہوں گا اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انھیں پتھر ماروں گا۔ اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کروں۔"

سعد بن عبداللہ حنفی نے عرض کی۔ واللّٰہ لا نخلّیک حتّیٰ یعلم اللّٰہ انّا قد حفظنا غیبۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ واٰلہٖ وسلم فیک واللّٰہ لو علمت انی اقتل ثم احیا ثم احرق حیّا ثم اذرّ یفعل ذٰلک بی سبعین مرّۃ ما فارقتک حتّیٰ القی حمامی دونک فکیف لا افعل ذٰلک

وانما هی قتلۃ واحدۃ ثم هی الکرامۃ التی لا انقضاء
لها ابداً۔

"خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ
خدا کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ہم نے رسالتمآبؐ کے
غائبانہ حق کو آپ کے بارے میں ادا کر دیا۔ خدا کی قسم اگر مجھے یہ
معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا پھر زندہ کیا جاؤں گا۔ پھر جیتے جی
جلا دیا جاؤں گا۔ پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی اور
ایسا ہی میرے ساتھ ستر مرتبہ ہو گا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ
چھوڑوں گا۔ جب تک کہ آخری موت مجھے آپ کے قدموں پر
نہ آئے۔ پھر چہ جائیکہ یہ تو ایک دفعہ قتل ہو جانا ہے، اور اس
کے بعد وہ عزت دائمی ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔"

زہیر بن قینؓ نے بھی کھڑے ہو کر ایسی ہی تقریر کی۔ اُنھوں نے کہا:

واللہ لوددت انی قتلت ثم نشرت ثم قتلت حتی
اقتل کذا الف قتلۃ وان اللہ یدفع بذلک القتل
عن نفسک وعن انفس ھؤلاء الفتیۃ من اھل بیتک

"خدا کی قسم میری تو یہ آرزو ہے کہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر
زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں۔ یوں ہی ہزار مرتبہ
میرے ساتھ سلوک ہو۔ لیکن کسی طرح آپ کی اور آپ کے اعزہ و
اقارب ان ہاشمی جوانوں کی جان بچ جائے جو آپ کے ساتھ ہیں۔

دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب نے متفق اللہجہ کہا۔

واللہ لانفارقک ولکن انفسنا لک الفداء نقیک بنحورنا وجباھنا وایدینا فاذا نحن قتلنا کنّا وفینا وقضینا ما علینا۔

"ہم آپ سے جدا نہیں ہوں گے، بلکہ اپنی جان آپ پر فدا کریں گے، اپنے سینہ، سر، بازو، تمام اعضاء وجوارح کو آپ کی سپر بنائیں گے۔ بے شک جب ہم مر جائیں تو پھر سمجھیں گے کہ ہم نے وفاداری سے کام لیا۔ اور جو ہمارا فرض تھا اُس کو ادا کر دیا۔"

مجمع منتشر ہو گیا۔ ہر ایک ساتھی کے دل میں کسی قسم کے خوف و دہشت، ہراس کے بجائے وہ قوت، وہ مسرّت تھی کہ دنیا کے تمام مشکلات ہیچ نظر آرہے تھے، اور صرف جان زہرؑا پر اپنی جان نثار کر دینے کی فکر تھی۔ حضرت نے انھیں حکم دیا کہ خیمے پاس پاس لگالیں، اور طنابیں خیموں کی باہم ایک دوسرے میں ملا دیں، اور پشت خیمہ پر ایک خندق کھود کر اس میں خشک لکڑیاں اور جنگل کی گھانس پات جمع کر دیں، تاکہ کل جب دشمن کا مقابلہ ہو تو اس خندق میں آگ روشن کر دی جائے۔ مطلب یہ تھا کہ دشمن کا مقابلہ صرف ایک طرف سے کیا جا سکے اور انھیں دوسری جانب

حملہ کرنے کی جراَت نہ ہو۔

۱۶

سولھواں باب

عاشور کی صبح

یقین ہے کہ آج کربلا کے میدان میں کوئی آنکھ رات کو نہیں سوئی ہوگی، اس طرف عبادت خدا، تسبیح و تہلیل، قعود و قیام بیتابیوں میں اضطراب۔ اور اُس طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی درستی، تدابیر جنگ میں مشورے اور صبح ہونے کا انتظار۔ رات کی مہلت ہی معلوم نہیں کس درجہ طبیعت پر بار تھی۔ اب صبح ہونے پر توقف کب ممکن تھا؟

پیغمبر اسلامؐ کے جگر کا خون بہانے والے اپنے کو مسلمان سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے صبح کی نماز پڑھی اور اس کے بعد بنی زادے کا خون بہانے میدان میں آگئے۔

فرزند رسولؐ نے بھی اپنے اصحاب کو مرتب کیا اور نماز صبح پڑھائی۔ تاریخ کی تصریح کے مطابق یہ بتیس ۳۲ سوار اور چالیس پیادے سے زیادہ نہیں تھے۔ (طبری ج ۶ ص ۲۴۱)

اس چھوٹے سے لشکر کی ترتیب دی گئی۔ میمنہ پر زہیر بن قین، میسرہ پر حبیب بن مظاہر، علمدار عباس ابن علیؑ۔ خیمے لشکر کے پس پشت اور خیموں کے پیچھے خندق میں آگ۔

یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کو پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم بیس تیس ہزار کی فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو، اور کئی گھنٹے کی مدت تک اُس سے مقابلہ کراتا رہا ہو۔

عمر سعد نے بھی اپنی فوج کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی۔ میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن۔ سواروں کا سردار عزرہ بن قیس احمسی۔ پیادوں کا افسر شبث بن ربعی یربوعی، اور علم اپنے غلام درید کے سپرد کیا۔

امام حسینؑ نے اپنے ہاتھ درگاہ خدا میں اُٹھائے، اور یہ دُعا پڑھی۔ موازنہ کرنا چاہیے عیسیٰ کی آواز سے، جو اناجیل کی نقل کے مطابق صلیب پر بلند ہوئی تھی۔

ایلی ایلی لما سبقتنی۔ "اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"
اور نبی زادے کی دعا میں جو اس سیلاب مصیبت کے اندر لبوں پر جاری تھی۔

اللھم انت ثقتی فی کل کرب	خداوندا تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف
ورجائی فی کل شدۃ	میں اور میرا قبلۂ اُمید ہے ہر سختی میں

وانت لی فی کلّ امر نزل بی ثقة وعدّة کم من همّ یضعف فیه الفؤاد وتقلّ فیه الحیلة ویخذل فیه الصّدیق ویشمت فیه العدوّ انزلته بک وشکوته الیک رغبة منّی الیک عمّن سواک ففرّجته وکشفته فانت ولیّ کلّ نعمة وصاحب کلّ حسنة ومنتهی کلّ رغبة۔

اور تجھ ہی پر مجھے ہر واقعہ میں جو مجھ پر پیش آئے بھروسا ہے۔ کتنے صدمے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی۔ دوست اُن میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن اُن میں طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں میں اُن کو تیری حضور میں پیش کرتا اور تجھ سے اُن کی شکایت کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا ہی نہیں جانتا۔ تو اُس تکلیف کو دور کرتا اور اُس کا تدارک کر دیتا ہے یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور ہر احسان کا مرکز اور ہر مطلب کا آخری مرجع ہے۔"

فوج عمر سعد سامنے کی طرف صف بستہ تھی مگر اُسے کمین گاہوں۔ حملوں کے بہترین موقعوں کی فکر بہت زیادہ تھی، اس لیے فوج کے لوگ پشت خیام کی طرف بھی جاتے تھے کہ اُس طرف سے حملہ کا موقع ہے یا نہیں، یہاں اُس طرف آگ شعلہ ور تھی جو اُس طرف سے حملہ کے خیال کو بالکل سرد کر دیتی تھی۔ اسں

ناکامی سے دلوں میں شعلوں کا بھڑکنا ضروری تھا اور جلے دل کے پھپھولے سخت کلامی اور زخم زبان کی صورت میں پھوڑے جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اصحاب کو اشتعال کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ لیکن امام حسینؑ کی رجہ داری اصحاب کو مشتعل ہونے سے روکتی اور ابتداءً جنگ کرنے سے باز رکھتی تھی اس موقع پر جب آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرقاب اُس طرف سے گزرا، خیموں پر نظر ڈالی۔ چاروں طرف آگ شعلہ ور نظر آئی۔ اُس نے پکار کر امامؑ کو مخاطب کر کے کہا:۔ استعجلت النار فی الدنیا قبل یوم القیامۃ۔

"تم نے قیامت کے دن سے پہلے ہی اپنے لیے دنیا میں آگ کا سامان کر لیا۔"

معاذ اللہ! فرزند رسولؐ سے یہ خطاب۔ حضرت نے اصحاب سے فرمایا یہ کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے شمر بن ذی الجوشن ہے۔ اصحاب نے عرض کیا۔ "ہاں فرزند رسولؐ یہ وہی ہے۔" حضرت نے فرمایا۔

انت اولیٰ بھا صلیاً۔ "جہنم کی آگ میں جلنے کا تو زیادہ مستحق ہے۔" مسلم بن عوسجہ جو ضعیف العمر تھے، مگر جملہ ایسا تھا کہ تمام اصحاب میں جوش پیدا ہو گیا تھا، انھوں نے کہا:

جعلت فداك الا ارمیه بسهم فانّه قد امکننی ولیس لیسقط سهم فالفاسق من اعظم الجبّارین۔

"میری جان آپ پر فدا۔ اجازت ہوتی ہے کہ ایک تیر اس کو ماردوں؟ کیوں کہ اس وقت یہ بالکل زد پر ہے۔ تیر خطا نہیں کرسکتا، اور یہ آدمی فاسق و فاجر بہت بڑا ہے۔"

حضرت نے فرمایا لا ترمه فانّی اکرہ ان ابدأهم۔ "نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔"

دونوں طرف کے لشکر خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ اب امامؑ نے چاہا کہ اتمام حجّت کردیں۔ میدان جنگ کی سواری ہے فرس۔ مگر ابھی جنگ منظور نہیں اس لیے حضرت نے ناقہ طلب فرمایا۔ صلح پسندی کا اظہار منظور تھا، ناقہ پر سوار ہوئے، قرآن منگوایا اُسے اپنے سامنے رکھا۔ پھر صفوف دشمن کے سامنے آئے۔ بلند آواز سے جو فوج کے اکثر حصّہ تک پہونچ سکتی تھی، ارشاد فرمایا

ایّها الناس اسمعوا قولی ولا تعجلونی حتّیٰ اعظکم بما الحقّ لکم علیّ وحتّیٰ اعتذر الیکم من مقدمی علیکم فان قبلتم عذری وصدقتم قولی واعطیتمونی النّصف کنتم بذلک اسعد ولم یکن لکم علیّ سبیل وان لم تقبلوا منّی العذر ولم تعطوا النّصف من انفسکم فاجمعوا امرکم وشرکاءکم ثمّ لا یکن امرکم علیکم غمّة ثمّ اقضوا

الیّ ولا تنظرون ان ولیّی اللہ الذی نزّل الکتاب وھو یتولّی الصالحین۔

"صاحبو! میری بات سنو۔ جلدی سے کام نہ لو یہاں تک کہ میں جیسا کہ میرے ذمہ تمھارا حق ہے۔ تم کو نصیحت کا فرض ادا کردوں اور میں تمہارے سامنے اپنا عذر پیش کردوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا؟ اگر تم نے میرے عذر کو تسلیم کر لیا، اور میری بات کو سچّی سمجھ لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو تم خوش قسمت ثابت ہوگے، اور تمھیں معلوم ہو گا کہ تمھیں میری مخالفت کا کوئی راستا نہیں ہے اور اگر تم نے میرے عذر کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے جمع کرلو اپنے شیرازہ کو اور اکٹھا کرلو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں کو اور کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے میرا خاتمہ کردو اور مجھے ایک دم کی بھی مہلت نہ دو، میرا مدد گار بس خدا ہے، جس نے قرآن کو نازل کیا، اور وہی اچھے اعمال والوں کا بس مددگار ہے۔

آواز حضرت کی خیمہ میں پہونچی تو مخدرات عصمت سے گریہ کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے جناب عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت زیادہ بعد کو آئے گا۔

جب آواز گریہ کی موقوف ہوئی تو حضرت نے حمد الٰہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف اُس کی ذات اقدس کے لحاظ سے ذکر فرمائے

پھر حضرت رسالتمآبؐ پر صلوٰۃ کا تذکرہ کیا، اور حضرت کے اوصاف و فضائل کو تھوڑی دیر تک بیان فرماتے رہے۔ راوی کا بیان ہے۔

فواللہ ما سمعت متکلماً قط قبلہ ولا بعدہ ابلغ فی منطق منہ

"میں نے حضرت کے قبل اور بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو آپ سے زیادہ فصاحت و بلاغت کا مالک ہو۔"

حمد و صلوٰۃ ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا۔

انسبونی فانظروا من انا ثم ارجعوا الی انفسکم وعاتبوھا

فانظروا ھل یحل لکم قتلی وانتھاک حرمتی۔

"ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو۔ دیکھو تو میں کون ہوں، پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو، غور تو کرو کہ تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟"

الست ابن بنت نبیکم وابن وصیہ وابن عمہ واول المومنین باللہ والمصدق لرسولہ بما جاء بہ من عند ربہ۔

"کیا میں نہیں ہوں تمہارے نبی کا نواسا، اور ان کے وصی، ان کے چچازاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کا فرزند؟"

اولیس حمزۃ سید الشھداء عم ابی اولیس جعفر الشھید الطیار ذوالجناحین عمی۔

"کیا حمزہ جو "سید الشہداء" کا لقب رکھتے ہیں، وہ میرے ہی

باپ کے چچا نہیں تھے۔ اور کیا جعفر طیار جنھیں خدا کی طرف سے دو پر پرواز کے لیے عطا ہوے وہ میرے ہی چچا نہیں تھے؟"

اولم یبلغکم قول مستفیض فیکم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال لی ولاخی ھذان سیدا شباب اھل الجنۃ۔

"کیا یہ حدیث تمہارے گوش زد نہیں ہوئی جو زبان زد خلائق ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانان اہل جنت کے سردار ہیں۔"

فان صدقتمونی بما اقول وھو الحق واللہ ما تعمدت کذبا مذ علمت ان اللہ یمقت علیہ اھلہ ویضر بہ من اختلقہ وان کذبتمونی فان فیکم من ان سألتموہ عن ذلک اخبرکم سلوا جابر بن عبد اللہ الانصاری او ابا سعید الخدری او سھل بن سعد الساعدی وزید بن ارقم او انس بن مالک سمعوا ھذہ المقالۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لی ولاخی اما فی ھذا حاجز لکم عن سفک دمی۔

"اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سچ ہی ہے اس لیے کہ میں جب سے سن تمیز کو پہونچا، کبھی میں نے

جان بوجھ کر غلط بات نہیں کہی تو خیر، اور اگر تم میری بات کو
غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر
تم پوچھو تو وہ بتلا دیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ انصاری سے،
ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے،
انس بن مالک سے، وہ تمھیں بتلائیں گے کہ انھوں نے رسالتمآب صلعم
سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے۔ پھر کیا یہ تمہارے لیے
میری خوں ریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے؟"
شمر نے کلام قطع کیا اور بول اٹھا کر
ھو یعبد اللہ علیٰ حرف ان کان یدری ما تقول۔
"میں خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں، اگر سمجھ میں میری
آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" (قرآن میں منافقین کی نسبت ہے۔
ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف۔ شمر کا مقصود ہے کہ
میں مسلمان نہیں منافق ہوں، اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ
رہے ہیں)۔
حبیب بن مظاہر نے کہا واللہ انی لاراك تعبد اللہ
علیٰ سبعین حرف فاوانا اشھد انك صادق ما تدری
ما یقول قد طبع اللہ علیٰ قلبك۔
"بخدا میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستر حرفوں پر کرتا
ہے (یعنی انتہائی مکار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے۔

ایک بات پر قائم نہیں رہتا) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ۔۔۔ تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں، خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔"

امامؑ نے پھر سلسلۂ تقریر جاری کیا، فرمایا۔ فان کنتم فی شک من ھذا القول افتشکون انی ابن بنت نبیکم فواللّٰہ ما بین المشرق والمغرب ابن بنت نبیٍّ غیری منکم ولا من غیرکم انا ابن بنت نبیکم خاصّۃ۔

"اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے، تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمہارے رسولؐ کا نواسا ہوں؟ خدا کی قسم مشرق و مغرب عالم میں کوئی نبی کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے۔ نہ تم میں اور نہ تمہارے سوا دوسرے ملل و اقوام میں، بس میں ہوں جو خاص تمہارے نبی کا نواسا ہوں۔"

اخبرونی اتطلبونی بقتیل منکم قتلتہ او مال لکم استھلکتہ او بقصاص من جراحۃ۔

"ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر کیوں آمادہ ہوئے ــــــ؟ کیا کسی اپنے مقتول کا بدلا لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کر دیا ہے؟ یا کسی زخم کا قصاص چاہتے ہو؟

ایک خاموشی سی چھائی رہی اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔

حضرت نے خاص طور سے شبث بن ربعی۔ حجار بن ابجر۔ قیس بن اشعث اور یزید بن حارث کو آواز دی (جو حضرت کو ایک خصوصی مکتوب تحریر کر چکے تھے) فرمایا:

الم تکتبوا الیّ ان قد اینعت الثمار واخضرّ الجناب و طمت الاجام وانّما تقدم علی جند لک مجنّد فاقبل۔

"کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ میوے پختہ و رسیدہ، اور کھیتیاں سرسبز و شاداب اور چشمے لبریز و پایاب اور لشکرِ آپ کی مدد کے لیے تیار رہیں ؟"

ان لوگوں نے جواب دیا کہ "ہم نے ایسا کوئی خط نہیں لکھا"

حضرت نے فرمایا: سبحان اللہ بلی واللہ لقد فعلتم۔

"کیوں نہیں خدا کی قسم تم نے لکھا تھا اور ضرور لکھا تھا۔"

پھر آپ عام لشکر کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا:

ایّھا الناس اذ کرھتمونی فدعونی انصرف عنکم الی مامنی من الارض۔

"اگر تم لوگوں کو میرا آنا ناپسند ہے تو مجھے واپس چلا جانے دو کسی جگہ جہاں میں امن و امان سے زندگی گذار سکوں۔"

یہ وہی بات ہے جو حضرت نے حُر کی فوج کے سامنے راہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ اور عمر سعد سے کربلا پہونچنے کے بعد کہلوائی۔ اور وہی آج بھی عام فوج سے مخاطب ہو کر پیش کر رہے ہیں اس کے معنی

یہ ہیں کہ آپ کا مسلک ایک تھا جو شروع سے پیش نظر تھا اور آخر تک قائم رہا۔ آپ کے مطالبات میں کسی قسم کی تبدیلی اور آرا و خیالات میں کسی طرح کا تغیر نہیں ہوا۔ وہ جیسا کہ ہم نے "اسوۂ حسینی" کے بیانات میں ذکر کیا ہے "امن وامان" اور "صلح پسندی" کو سب سے مقدم سمجھتے تھے، جہاں تک کہ حمایت باطل کا سوال نہ پیدا ہو۔ اور حمایت باطل کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے چاہے اپنی جان چلی جائے۔

قیس بن اشعث (جو محمد بن اشعث کا بھائی ہے۔ اس کی بہن جعدہ بنت اشعث امام حسنؑ کی زہر خورانی کی ذمہ دار، اور محمد بن اشعث حضرت مسلم کے قتل کا ذمہ دار تھا)۔ اس نے پکار کر کہا:۔

"آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟"

حضرت نے فرمایا:

انت اخو اخیک اترید ان یطلبک بنو ھاشم باکثر من دم مسلم بن عقیل لا واللہ لا اعطیھم بیدی اعطاء الذلیل ولا اقر اقرار العبید۔

"کیوں نہ ہو تو اپنے بھائی محمد بن اشعث ہی کا تو بھائی ہے کیا تو اتنے کو کافی نہیں سمجھا کہ مسلم بن عقیل کے خون کی ذمہ داری تجھ پر عائد ہے۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں اور غلامانہ زندگی کا اپنے لیے

اقرار کر لوں، ہرگز نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔"

حجت تمام ہو چکی۔ فوج مخالف کا اثر پذیر ہونا پہلے ہی سے متوقع نہیں تھا، اپنا فرض پورا کرنا تھا، وہ پورا ہو چکا۔ حضرت نے ناقہ کو بٹھا دیا۔ اُتر پڑے اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دو۔

اب اصحاب کی باری آئی۔ انھوں نے بھی چاہا کہ فوج مخالف کو امکان بھر نصیحت کر دیں۔ امام حسینؑ کے پُرجوش ساتھی زہیر ابن قین، گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرقاب صف سے باہر نکلے۔ پکار کر کہا:-

یا اهل الکوفة نذار لکم من عذاب الله نذار ان حقا علی المسلم نصیحة اخیه المسلم ونحن حتی الان اخوة وعلی دین واحد وملة واحدة مالم یقع بیننا وبینکم السیف وانتم للنصیحة منا اهل فاذا وقع السیف انقطعت العصمة وکنا امة وانتم امة۔

"کوفہ والو! ڈرو خدا کے عذاب سے ڈرو۔ ایک مسلمان کے ذمہ اُس کے اسلامی بھائی کے حق میں فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اُسے نصیحت کرے۔ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ابھی تک ایک ہی مذہب اسلام کے پیرو، اور ایک ہی ملت نبویہ کے تابع ہیں۔ جب تک کہ ہمارے تمہارے درمیان تلوار نہیں کھنچ گئی ہے، اور

تم ابھی ہماری طرف سے نصیحت کے مستحق ہو۔ بے شک جب تلوار چلنے لگے گی، اُس وقت اسلامی رشتہ داری ختم ہو جائے گی، اور ہم ایک اُمت اور تم دوسری اُمت ہو جاؤ گے۔"

ان اللّٰہ قد ابتلانا و ایاکم بذریۃ نبینا محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم لینظر ما نحن و انتم عاملون انا ندعوکم الی نصرھم وخذلان الطاغیۃ عبید اللّٰہ بن زیاد فانکم لا تدرکون منھما الا بسوء عمر سلطانھما کلہ لیسملان اعینکم ویقطعان ایدیکم وارجلکم ویمثلان بکم ویرفعانکم علی جذوع النخل ویقتلان اماثلکم وقراءکم امثال حجر بن عدی واصحابہ وھانی بن عروۃ واشباھہ۔

"یقیناً خدا نے ہماری اور تمہاری آزمائش کی ہے، اپنے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم اُن کے ساتھ کیا کرتے ہیں، اور تم کیا سلوک اختیار کرتے ہو۔ ہم تم کو دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید اور ابن زیاد سے تم کو اُن کی تمام سلطنت کی عمر بھر سوا بُرائی کرنے کے کوئی اچھا سلوک نظر نہ آئے گا۔ وہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے، تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کرتے، اور تم کو مثلہ کرتے، تم کو سولیوں

پر چڑھاتے اور تمہارے اچھے حفاظ قرآن مثلاً حجر بن عدی اور اُن کے ہمراہیان اور ہانی بن عروہ وغیرہ ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔"

کوفہ والے سلطنت کے ہواخواہ اور خوشامدی اشخاص نے زہیر کو بُرا کہنا شروع کیا، اور ابن زیاد کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے، اور کہا ہم اُس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تمہارے سردار اور اُن کے ساتھیوں کو قتل نہ کر دیں یا گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس لے جائیں۔"

زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے اور ہدایت کرتے رہے یہاں تک کہ شمر نے تیر لگایا اور کہا" بس خاموش، خدا تیری زبان کو خاموش کرے۔" زہیر نے تیر کی کوئی پرواہ نہیں کی اور شمر سے مصروف کلام ہو گئے۔ شمر کے اس کہنے پر کہ دیکھو تھوڑی دیر میں تم اور تمہارے سردار سب قتل ہوا چاہتے ہیں زہیر نے بڑی جگرداری اور قوت ایمانی کے ساتھ کہا۔

افبالموت تخوفنی فواللّٰہ للموت معہ احبّ الیّ من الخلد معکم۔

"تو مجھے موت سے خوف دلاتا ہے۔ خدا کی قسم مرنا اُن کے ساتھ مجھے تم لوگوں کے ساتھ زندگی جاوید حاصل کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔"

اس کے بعد پھر لشکر کی طرف مخاطب ہو گئے، اور کہا:

"اے اللہ کے بندو! ایسے بندگان زر کے کہنے میں نہ آؤ، خدا کی قسم پیغمبر خدا کی شفاعت اُن لوگوں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جنھوں نے پیغمبر خدا کی اولاد کا خون بہایا اور اُن کے مددگاروں کو قتل کیا ہو!"

امام حسینؑ نے یہ دیکھ کر کہ باتوں کا جواب تیر سے مل رہا ہے اور اتمام حجت کا فرض ادا ہو چکا ہے، کسی سے پکار کر کہلوایا کہ

اقبل فلعمری لئن کان مؤمن آل فرعون نصح لقومه وابلغ فی الدعاء لقد نصحت لهؤلاء وابلغت لو نفع النصح والابلاغ۔

"زہیر! واپس چلے آؤ۔ اگر مومن آل فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر دی تھی اور اس فرض کو ادا کر دیا تھا، تو یقیناً تم بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے، اور تم نے نصیحت کے حق کو ادا کر دیا ہے۔ مگر نصیحت و تبلیغ کا کوئی فائدہ بھی تو ہو۔"

اس آواز کو سُن کر زہیر واپس چلے آئے۔

ان ہدایات کا، ان مواعظ کا، ان نصیحتوں کا دشمن کی فوج پر اثر کیا ہوتا۔ محبت دنیا میں اندھی آنکھیں کسی چراغ کی روشنی سے فیضیاب ہونے پر تیار نہیں تھیں۔

بے شک حر بن یزید ریاحی، جو امامؑ کا سدِّ راہ ہوا تھا، اور گھیر کر کربلا لایا تھا، صلح پسندانہ طرزِ عمل اور حقیقت افروز بیانات و نصائح سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہ ضمیر کی ہدایت سے مجبور ہو گیا۔ عمر سعد کے پاس آیا اور کہا امقاتل انت ھذا الرجل۔ "کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے؟"

عمر سعد نے کہا۔ ای واللہ قتالاً ایسرہ ان تسقط الرؤس و تطیح الایدی۔

"بے شک بخدا کی قسم ایسی سخت جنگ جس کا کم از کم نتیجہ یہ ہے کہ سروں کی بارش ہو، اور ہاتھ کٹ کٹ کر زمین پر گریں!"

حر نے کہا؟ فما لکم فی واحدۃ من الخصال التی عرض علیکم رضا۔

"کیا اتنے مطالبے جو حسینؑ نے پیش کیے، ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک منظوری کے قابل نہیں ہے؟"

عمر سعد نے کہا۔ واللہ لو کان الامر الی لفعلت لکن امیرک قد ابی ذالک۔

"خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا، لیکن کیا کروں کہ تمہارا حاکم (ابن زیاد) نہیں مانتا۔"

حرؑ نے یہ سن کر کچھ گفتگو کرنا بیکار سمجھا۔ ہٹ کر ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ قرہ بن قیس ایک شخص حرؑ کے قبیلہ میں سے تھا، غالباً یہ وہی شخص ہے

جو عمر سعد کا پیغام لے کر امامؑ کی خدمت میں آیا تھا، اور حبیب بن مظاہر کے نصیحت کرنے پر اُس نے کہا تھا کہ میں جا کر جو پیغام لایا ہوں اُس کا جواب دے دوں تو پھر غور کروں گا۔) وہ اس وقت حُر کے پاس تھا۔ حُر نے اُس کو اپنے پاس سے ٹالنا چاہا۔ کہا "قرہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟" اُس نے کہا "نہیں۔" کہا "تو پھر پلاؤ گے نہیں؟" قرہ کو احساس ہوا کہ حُر مجھ کو اپنے پاس سے ٹالنا چاہتے ہیں، اور شاید جنگ سے علیحدہ ہونا منظور ہے اور یہ اندیشہ کہ میں مخبری نہ کروں۔

اُس نے کہا کہ "اچھا جاتا ہوں، پانی پلائے لاتا ہوں!"

قرہ بن قیس کا بیان تھا کہ اگر حُر مجھ سے یہ بتلا دیتے کہ میں امام حسینؑ کی طرف جا رہا ہوں تو میں بھی یقیناً ان کے ساتھ ہو لیتا اور نکل جاتا۔"

مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں اور نخواہ مخواہ کے عذر ہیں جو وقت نکلنے کے بعد پیش کیے جاتے ہیں ورنہ حُر کے بچے کچے ہو چلے جانے پر بھی قرہ کے لیے راستا بند نہیں ہو گیا تھا، اور وہ جانا چاہتا تو چلا جاتا۔

بہر حال قرہ تو اُس جگہ سے علیحدہ ہٹ گیا۔ حُر نے آہستہ آہستہ گھوڑا اپنا فوج امامؑ کی طرف بڑھانا شروع کیا مہاجر بن اوس جو انہی کے قبیلہ کا ایک دوسرا شخص تھا، اُس نے کہا:

"کیوں حُر! کیا ارادہ ہے؟ کیا حملہ کرنا چاہتے ہو؟" حر نے زبان سے کچھ جواب نہیں دیا، مگر جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔

مہاجر نے کہا! "حر یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ میں نے تمہاری کسی موقع پر یہ حالت نہیں دیکھی۔ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟ تو میں تمھارے سوا کسی کا نام نہ لیتا۔ مگر میں اس وقت تمھاری عجیب حالت دیکھ رہا ہوں۔ آخر یہ کیا ہے؟"

حُر نے کہا "میرے سامنے اس وقت جنّت اور دوزخ کا سوال درپیش ہے۔ میں تو جنّت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا چاہے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے، اور آگ میں جلا دیا جائے۔"

یہ کہتے ہی گھوڑے کو چابک لگایا اور لشکر امام حسینؑ میں پہونچ گئے۔

امامؑ اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے، حُر خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا:

"میری جان آپ پر نثار اے فرزند رسولؐ! میں وہی مجرم ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا تھا، اور آپ کے ساتھ ساتھ رہا تھا یہاں تک کہ آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا، اُس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کریں گے مسترد کر دیں گے، اور نوبت یہاں تک پہونچے گی۔ میں نے اپنے دل میں

خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے، میں ایک حد تک ان لوگوں کے ساتھ ملا رہوں اور یہ ظاہر نہ ہونے دوں کہ میں ان کی عدول حکمی پر آمادہ ہوں، پھر یہ لوگ اُن شرائط کو تو قبول کر ہی لیں گے جو امام حسینؑ ان کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، اور خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کے منظور نہ کریں گے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں، انتہائی شرمسار، توبہ کرتا ہوا اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں، اور شرکت کرتا ہوا آپ کی مصیبت میں اپنی جان کے ساتھ یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کر دوں، کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

حُر کے الفاظ میں سچائی تھی۔ دل کی دھڑکن کا اثر آواز کے ارتعاش سے ظاہر اور خون کی رفتار سست ہونے کا نشان چہرہ کی زردی سے نمایاں تھا۔

رحم دل امامؑ کو اُس کا یہ اضطراب کچھ دیر تک قائم رہنا گوارا نہ ہوا، اور بے ساختہ فرما دیا۔

نعم یتوب اللہ علیک و یغفر لک ما اسبلک۔

"ہاں ہاں۔ خدا تمھاری توبہ کو قبول کرے گا اور تمھیں بخش دے گا۔ ہاں بتاؤ تو کہ تمھارا نام کیا ہے؟"

اُس نے کہا "حُر بن یزید"۔

حضرت نے فرمایا انت الحر کما سمتک امک انت الحر
ان شاء اللہ فی الدنیا والآخرۃ انزل۔
بے شک تم آزاد ہو جیسا تمھاری ماں نے تمھارا نام
رکھا تھا۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔
گھوڑے سے تو اُترو۔"
حُر نے کہا: انا لک فارسا خیر منی راجلا اقاتلھم علی
فرسی ساعۃ والی النزول ما یصیر اخر امری۔
"میں آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ بہتر ہے
اس سے کہ پیادہ ہوں۔ بس ایک تھوڑی دیر ان سے جنگ کرنا
ہے، اور پھر تو (مرکر) گھوڑے سے نیچے آنا ہی ہے!"
حضرت نے فرمایا۔ فاصنع یرحمک اللہ ما بدالک۔
" اچھا۔ تمہاری خوشی۔ جو تمھیں منظور ہو ویسا ہی کرو۔"
حُر آئے صفوف اہل کوفہ کے مقابل ہیں۔ کہا ایھا القوم الا
تقبلون من حسین خصلۃ من ھذہ الخصال التی عرض
علیکم فیعافیکم اللہ من حربہ وقتالہ۔
" بھائیو! آخر حسینؑ سے ان باتوں میں سے جنھیں وہ پیش
کرتے ہیں کسی بات کو تم منظور کیوں نہیں کر لیتے کہ تمھیں اُن
سے جنگ کرنے اور لڑنے سے نجات ملے۔"
لوگوں نے کہا کہ امیر عمر بن سعد موجود ہیں، جو کچھ تمھیں کہنا ہو

اُنہی سے کہنا چاہیے۔

حُر نے پھر عمر سعد سے یہی الفاظ کہے، اور ویسا ہی جواب ملا جو اس کے قبل مل چکا تھا کہ "اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا"۔ حُر متوجہ ہوئے عام اہل کوفہ کی طرف اور حسب ذیل تقریر کی:۔

یا اھل الکوفۃ لامّکم الھبل اذ دعوتموہ حتّٰی اذا اتاکم اسلمتموہ وزعمتم انّکم قاتلوا انفسکم دونہ ثمّ عدوتم علیہ لتقتلوہ امسکتم بنفسہ واخذتم بکظمہ واحطتم بہ من کلّ جانب فمنعتموہ التوجّہ فی بلاد اللہ العریضۃ حتّٰی یأمن و یأمن اھل بیتہ واصبح فی ایدیکم کالاسیر لا یملک لنفسہ نفعا ولا یدفع ضرًّا وحلّأتموہ ونسآء واصبیتہ واصحابہ عن ماء الفرات الجاری الذی یشربہ الیھودی والمجوسی والنصرانی وتمرّغ فیہ خنازیر السواد وکلابہ وھاھم قد صرعھم العطش بئسما خلفتم محمّدًا فی ذرّیتہ لا اسقاکم اللہ یوم الظماء ان لم تتوبوا وتنزعوا عمّا انتم علیہ من یومکم ھذا فی ساعتکم ھذہ۔

"اے کوفہ والو! تمھاری ماؤں کو تمھارے غم میں رونا نصیب
تم نے حسینؑ کو بلایا، جب وہ آئے تو تم نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔
تم نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ ہم آپ پر اپنی جانیں نثار کریں گے۔

پھر تم نے خود ان پر چڑھائی کر دی اور اُن کے قتل پر آمادہ ہو گئے تم
نے اُن کو روک لیا ہے۔ اُن کے نفس کی آمد و شد کے راستے کو بند
کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اُن کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے
تم نے اُن کو خدا کی چوڑی چکلی زمین میں جہاں وہ اور اُن کے اہلبیتؑ
امن و امان کی زندگی بسر کر سکیں جانے سے روک دیا ہے اور
وہ تمہارے درمیان مثل ایک قیدی کے ہو گئے ہیں اور بے بس
ہیں۔ تم نے اُن کو، اُن کے اہل حرم کو، اُن کے چھوٹے چھوٹے
بچّوں کو اور اُن کے اصحاب کو بہتے ہوئے فرات کے پانی سے بھی
روک دیا ہے۔ جس میں یہودی، نصرانی اور مجوسی تک سیراب
ہوتے اور عراق کے سؤر، کتّے تک آ آ کر نہاتے اور لوٹتے پوٹتے ہیں۔
اور دیکھو ان کی یہ حالت کہ پیاس نے اُن کی طاقتوں کو کمزور
اور انھیں بجاں بلب کر دیا ہے۔
کیا بُرا سلوک کیا ہے تم نے محمدؐ کی اولاد کے ساتھ اُن کی
وفات کے بعد خدا تم کو اُس شدت والی پیاس کے دن (روز قیامت)
سیراب نہ کرے اگر تم ابھی، آج ہی اسی دم توبہ نہ کر لو اور اپنے
طرز عمل سے پشیمان ہو کر باز نہ آ جاؤ۔"
حُربن یزید جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس طرف ایک بڑی تعداد
کے رسالہ کا افسر تھا اور ہزاروں آدمی اس کے چشم و ابرو کے تابع
تھے۔ اب وہ اپنا مخالف اور دشمن کا یار و مددگار تھا۔ اس لیے

اُس کی کوئی بات سُننے کے قابل اور کوئی مشورہ قبول کرنے کے لائق نہ تھا۔

کمانیں کڑکیں اور تیر چلے اور کچھ لوگوں نے تیروں سے حُر پر حملہ کردیا۔ حُر کو اُن کے اثر پذیر ہونے سے مایوسی ہوگئی۔ جنگ پورے طور سے ابھی چھڑی نہ تھی اس لیے حُر وہاں سے ہٹ کر امامؑ کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

واقعات کا سلسلہ سامنے آچکا ہے، اُس سے یہ نتیجہ نکال لیا جا چکا ہوگا کہ حسینؑ اپنی جانب سے جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ برابر ایسی صورتیں پیش کر رہے تھے کہ لڑائی نہ ہو اور خوں ریزی تک نوبت نہ پہونچے۔

صرف اُسی وقت نہیں جب وہ ظاہری حیثیت سے بالکل مجبور ہوگئے تھے اور چاروں طرف سے گھر گئے تھے بلکہ اس کے قبل بھی اُن کا طرزِ عمل یہی تھا اور وہ یکساں صورت پر برابر قائم رہا۔ فوج کشی و صف بندی اور صلح کی تمام امیدیں قطع ہونے کے بعد بھی آپ کی طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں ہوئی اور سخت سے سخت مواقع پر آپ اصحاب کو برابر روکتے رہے۔ یہی وہ قولی و عملی تعلیم تھی جو آپ کو اپنے والد بزرگوار امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کی سیرتِ زندگی سے پیش نظر تھی اور اُسی پر آپ سختی کے ساتھ قائم رہے

لیکن اب وہ وقت آیا کہ دھوپ چڑھ چکی ہے۔ دن کا کچھ حصّہ گذر گیا ہے۔ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا۔ درید کو آواز دی کہ "علم اپنا میرے قریب لا"۔ درید رایت جنگ کے لیے قریب آگیا۔ عمر سعد نے تیر اپنا چلہ، کمان میں جوڑا اور امامؑ کی طرف رہا کیا۔ پکار کر کہنے لگا "گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے ہی لگایا ہے۔" گواہ ہیں بے شک گواہ ہیں، تاریخ کے ورق گواہ ہیں، اسلامی افراد کے دل گواہ ہیں، کربلا کا تختہ گواہ ہے عاشور کا دن گواہ ہے، اسلام کا جگر گواہ ہے جو اُس تیر سے گھائل ہو گیا۔ انسانیت کی پیشانی گواہ ہے جو داغدار ہوی مذہب کا گلا گواہ ہے جو اُس سے چھد گیا۔ پیغمبر اسلامؐ گواہ ہیں جن کے دل پر اُس تیر کا اثر پڑا، فاطمہ زہراؑ کا کلیجہ گواہ ہے جو اُس سے خون ہو گیا۔ خدا خود گواہ ہے جو ہر موقع پر حاضر و ناظر ہے۔ یہ گواہیاں سب موجود ہیں مگر حاکم کوفہ کے دربار کے لیے نہیں، رے کی حکومت کے لیے نہیں، وہ تو بد بخت تیرے مقدر میں ہے ہی نہیں، اُس سے تجھے محروم ہونا ہے اور ضرور محروم ہوگا۔ تجھے عراق کے گندم سے حسینؑ کے بعد (جیسا کہ حسینؑ نے کہہ دیا تھا) سیر ہو کر کھانا نہیں نصیب ہوگا۔ تجھے جیسا تو نے خود (ہنسی کے طور پر) آرزو کی تھی جَو بھی کھانا میسر نہیں ہوگا تجھے دنیا ہی میں بہت کم رہنا نصیب ہوگا۔ گواہیاں ہیں سب

لیکن عذاب ابدی کے لیے، آخرت کی نہ ختم ہونے والی سزا کے لیے، جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے لیے، وہاں اگر تجھے رے کی حکومت ہی کا لطف ملے۔

زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ سے روپئے اشرفیوں کی جھنکار کا احساس ہو، اور آگ کے سنہری رنگ سے طلائی سکّوں کا رنگ یاد آئے، قطران کے لباس میں حریر و دیبا کے خلعت نظر آئیں تو خوش ہو لینا اور خوب خوش ہونا۔ سمجھ لینا کہ رے کی حکومت ہے، جو قتل حسینؑ کا جائزہ و انعام ہے۔

بس یہ تھا آغاز جنگ۔ اب حسینؑ اور استقلال۔ ثابت قدمی ہے اور پُر جگری۔ حمایت باطل سے علیحدگی ہے اور بات پر مرمٹنا۔ اب یہ ثابت کرنا ہے کہ "ہم جان دیں گے مگر فاسق و فاجر کی بیعت نہ کریں گے۔ دنیا سے اپنی ہستی کے فنا ہونے پر راضی ہو جائیں گے مگر اسلام کے فنا ہونے پر راضی نہ ہوں گے۔

بے شک اسی ثبات، اسی استقلال، اسی قوّت دل، اسی طاقت نفس کے ساتھ حسینؑ نے اس معرکہ کو سر کیا جو "مجاہدہ کربلا" کے نام سے اسلام کی تاریخ کا سرنامہ اور اہم اقوام کے لیے بہترین تعلیمات کا سرچشمہ ہے۔

سترھواں باب

جنگ کا آغاز

"گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے ہی لگایا ہے" یہ الفاظ سپہ سالار لشکر کی زبان پر جاری ہوتے ہوئے تیر رہا کیا جائے اور پھر تمام فوج میں سکون رہے!

یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلّے کھنچے اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تیروں کا حملہ بہادری کی نشانی نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ کی جنگ جو آتشیں اسلحہ کی بنیاد پر ہے جس طرح بزدلانہ حیثیت رکھتی ہے ایسے ہی سابق زمانہ کی تیروں کی بارش، کیا شرم کی بات نہیں۔ ایک ایسی قلیل تعداد جو کئی سو تک کبھی نہ پہونچی ہوئی ہو اُس پر حملہ ہو۔ اُس بڑی فوج کی طرف سے جو تیس ہزار سے ہرگز کم نہ ہو اور پھر تیروں کے بے پناہ باران سے ابتدا کی جائے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ حسین بن علیؑ کی قلیل فوج اس اچانک حملہ کے مقابلہ کے لیے کس حد تک آمادہ تھی!

مگر نہیں۔ اُنھیں آمادگی کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کے تنے ہوئے سینے تیروں کے استقبال کے لیے موجود تھے اور اُن کے دل و جگر شہادت کے اشتیاق میں ناوکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر تیار۔

یزیدی لشکر والوں کو اندازہ تھا اور یقینی حیثیت سے اندازہ کہ اگر حسینی لشکر سے وہ کتنا ہی مختصر سہی دست بدست مقابلہ کیا جائے تو کربلا کی تاریخ صرف عاشورا کے دن پر ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دیر ہونا اُن کے مقصد کے لیے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ اُنھیں خوب معلوم تھا کہ امامؑ کے خطوط بصرہ بھی گئے ہوئے ہیں اور وہاں سے مدد پہونچنے کی توقع ہے کوفہ کے بھی بہت سے لوگ جو مسلم کے مددگار تھے فضا کے بدل جانے اور حکومت کے ظلم و استبداد قائم ہو جانے کی وجہ سے اگرچہ گوشوں میں چھپ گئے ہیں مگر موقع کے منتظر ہیں اور نصرت حسینؑ کے لیے بے چین ہیں۔ یہ بھی خطرہ کچھ دور نہیں تھا کہ ایران نزدیک ہے اور وہاں کے لوگوں کو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت کا ہونا ممکن ہے خصوصاً جب کہ آپ کے ساتھ زین العابدینؑ بھی موجود ہیں جو ننھیالی رشتہ سے ایرانی ملک کے شاہزادے ہیں اور اس لیے بہت امکان ہے کہ قومی تعصب بھی ایرانیوں کو اُن کی حمایت پر آمادہ کر دے۔ یہ بھی خیال ہو سکتا تھا کہ نجد کے پہاڑ

(جا و سلمیٰ) بہت زیادہ فاصلہ پر نہیں ہیں جہاں کا "طے" ایک پُر طاقت قبیلہ ہے اور طرماح بن عدی امام حسینؑ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ اگر آپ وہاں پہونچ جائیں تو آپ کی مدد کے لیے ہزاروں جوان قبیلۂ طے کے ابھی زرہ پوش ہو سکتے ہیں"۔

انھیں اسباب سے جلدی کی تھی اور بہت جلدی معلوم ہوتا تھا کہ مقابل میں فوج ہے اور بہت بڑی فوج۔ جنگ ہوگی اور مکمل جنگ، تیر اندازی اور ہزاروں تیروں کی بارش۔

ماضی اور پھر تیرہ سو برس گذشتہ کے ماضی میں واقعات کے سمجھنے اور اُن کے ترتیب دینے میں اگر غلطی ہو تو کچھ قابل تعجب نہیں ہے۔

علامۂ مجلسی ایسے وسیع النظر انسان کو اس مقام پر دھوکا ہوا ہے اور بہت سخت دھوکا کہ اُنھوں نے لکھا ہے:-

فلما رموهم هذه الرمية قتل اصحاب الحسين وقتل فی هذه الحملة خمسون رجلا۔

جب یہ تیروں کی بارش ہوی تو اصحاب حضرت سید الشہداء کی تعداد بہت گھٹ گئی اور اس حملہ میں پچاس آدمی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں "حملۂ اولیٰ" (پہلے حملہ) کے نام سے

ایک خوں ریز حملہ کا تذکرہ ہے جس میں اصحاب حضرت امام حسینؑ میں سے پچاس آدمی شہید ہوئے تھے۔ مجلسی یا اُن کے پہلے محمد بن ابی طالب کو جن سے مجلسی نے یہ مضمون نقل کیا ہے یہ شبہ ہوا کہ "حملہ اولیٰ" سے مراد وہی تیروں کا حملہ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے "حملہ اولیٰ" سے مراد وہ حملہ ہے جو ظہر سے ایک گھنٹہ پہلے ہوا تھا جس میں بہت بڑی مخالف فوج نے بہت قریب آ کر حسینیؑ لشکر کی مختصر جماعت پر حملہ کیا تھا جس کا تذکرہ اس کے بعد آئے گا۔

تیروں کی اس ابتدائی بارش کا کوئی خاص اثر فوج حسینی پر سوا اس کے نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ اُن کے لیے پیغام جنگ ثابت ہو۔ امام حجت پورے طور سے تمام کر چکے تھے اور اب یہی ایک حجت باقی تھی کہ ابتدا جنگ کی دشمن کی طرف سے ہو جائے چنانچہ وہ بھی ہو گئی۔ کوئی ہراس نہیں، کوئی اضطراب نہیں، امامؑ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا قوموا رحمکم اللّٰہ الی الموت الذی لا بدّ منہ فان ھٰذہ السھام رسل القوم الیکم "کھڑے ہو جاؤ خدا رحمت نازل کرے تم پر۔ موت کے استقبال کو جو بہر حال ضروری ہے۔ یہ تیر نہیں ہیں بلکہ قاصد ہیں دشمن کے جو تمھاری طرف روانہ کیے گئے ہیں۔" اصحاب حسینؑ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے بھی تیروں کا جواب تیروں کے ساتھ دیا۔

لڑائی تو اب با قاعدہ چھڑ ہی گئی تھی۔ فوج شام میں سے
دو غلام ایک یسار غلام زیاد بن ابیہ اور ایک سالم غلام عبیداللہ
بن زیاد میدان جنگ میں آئے اور انھوں نے مبارز طلب کیا۔
فوج حسینی میں سے حبیب بن مظاہرؓ اور بریر بن خضیرؓ جوش میں
کھڑے ہوئے آگے بڑھے مگر امامؑ نے ان کو روک دیا۔
عبداللہ بن عمیر کلبی نے اجازت مانگی۔ یہ بہادر اپنی بیوی امّ وہب
بنت عبد کے ساتھ کربلا آیا ہوا تھا۔ اُس نے کھڑے ہو کر
اجازت جنگ مانگی۔ حضرت نے سر سے پیر تک اُس کا حلیہ دیکھا
گندمی رنگ لانبا قد۔ مضبوط کلائیاں اور بازو۔ چوڑی پشت
اور سینہ۔ حضرت نے فرمایا بہادر اور جنگ آزما جوان معلوم ہوتا
ہے۔ جاؤ اگر تمہارا دل چاہتا ہے۔ شیر دل جوان میدان جنگ
میں آیا۔ دونوں نے نام و نسب پوچھا۔ معلوم ہوا، کہا ہم تم کو
نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ میں زہیر بن قینؓ یا حبیب بن مظاہرؓ
یا بریر بن خضیرؓ کو آنا چاہیئے۔ عبداللہ کو غصّہ آگیا اور حملہ کیا۔
پہلے ہی وار میں یسار کا کام تمام کر دیا۔ عبداللہ اس طرف
متوجہ ہوئے تھے کہ سالم نے تلوار کا وار کیا، تلوار سر پر آچکی تھی
کہ خبر ہوئی بہادر نے بائیں ہاتھ کو سپر بنا دیا۔ تلوار نے انگلیاں
بائیں ہاتھ کی قطع کر دیں عبداللہ نے اتنی دیر میں پلٹ کر
ایک ضرب شمشیر میں اُس کا بھی خاتمہ کیا۔ اور جوش میں یہ رجز

پڑھنا شروع کردی:

ان تنکرونی فانا ابن کلب | حسبی ببیتی فی علیم حسبی
انّی امرؤ ذو مرّۃ وغضب | ولست بالخوّار عند النکب
انّی زعیم لک امّ وھب | بالطعن فیھم مقدماً والضرب
ضرب غلام مؤمن بالربّ

"اگر مجھے نہ جانتے ہو تو پہچان لو کہ میں کلب کا فرزند ہوں۔ میرے حسب ونسب کے لیے اتنا کافی ہے کہ قبیلۂ علیم میں میرا گھرانا ہے میں ایک سخت مزاج درشت خصلت انسان ہوں اور مصیبت کے وقت کمزوری اختیار کرنے والا نہیں ہوں۔ اے ام وہب میں ذمہ داری کرتا ہوں تم سے کہ ان میں بڑھ بڑھ کر نیزہ لگاؤں گا اور تلواریں ماروں گا۔ اس طرح کہ شمشیر زنی جو خدا پر ایمان رکھنے والے جواں ہمت انسان کو کرنا چاہیے۔

معلوم نہیں، ان اشعار میں کون سا جوش انگیز اثر تھا کہ ام وہب (زوجۂ عبداللہ بن عمیر) کے دل میں طوفانی تلاطم برپا ہو گیا اور ایک عمود خیمہ ہاتھ میں لے کر میدان میں یہ کہتی ہوئی آ گئی۔

فداک ابی وامّی قاتل | میرے باپ اور ماں تم پر
دون الطیبین ذریّۃ | نثار، پاک و پاکیزہ اولاد رسول
محمّد۔ | کی امداد میں کوتاہی نہ کرو
جنگ جاری رکھو۔

عبداللہ بن عمیر کو اس ناگہانی صورت سے انتہائی تکلیف محسوس ہوئی۔ زوجہ کے پاس آکر چاہا کہ سراپردۂ حسینی کی طرف واپس پہونچا دیں مگر عورت اپنی چادر عبداللہ کے ہاتھوں سے چھڑانے لگی اور کہنے لگی کہ "انی لن ادعک حتّیٰ اموت معک (میں تمھیں چھوڑ کے جاؤں گی نہیں جب تک کہ تمھارے ساتھ میں بھی قتل نہ ہوں۔"

امام حسینؑ نے جو یہ دیکھا آواز دی "خدا تم زن و شوہر کو جزائے خیر دے، اے مومنہ واپس چلی آ (خدا تجھ پر رحمت نازل کرے) عورتوں کی طرف، اور اُن کے ساتھ گھر میں بیٹھ جا کیونکہ عورتوں کو جہاد کا حکم نہیں ہے۔" امامؑ کے حکم کا اثر لیا اور وہ مومنہ خیمۂ اہل حرم میں واپس آئی۔

عمرو بن حجاج نے جو میمنۂ فوج پر تھا حسینی فوج کے میسرہ پر حملہ کیا جب وہ لوگ قریب پہونچے تو ان بہادروں نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور نیزے سیدھے تان لیے۔ دشمن کے گھوڑے نیزوں کی باڑھیں دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہر گئے اور آگے نہ بڑھ سکے جب وہ لوگ واپس ہونے لگے اور رُخ اپنا دوسری طرف پھیرا تو انھوں نے تیروں کی بارش کر دی، اس سے چند آدمی اُن میں کے قتل ہوئے اور چند زخمی ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں سیدالشہداؑ اور اُن کے اصحابؓ نے فنِ سپہ گری کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اتنی چھوٹی فوج اور وہ اتنی بڑی فوج سے برسرپیکار ہو اور اُس میں اتنا طویل وقت صرف ہو سکے۔

حر بن یزید ریاحیؓ نے جو فوج حسینی کی طرف منتقل ہو ہی چکے تھے خدمت میں آکر عرض کیا۔

یا ابن رسول اللہ کنت اوّل خارج علیک فاذن لی لاکون اوّل قتیل بین یدیک واوّل من یصافح جدّک غدا۔

فرزند رسولؐ! میں سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا، لہذا آپ مجھے اجازت دیجیے کہ سب سے پہلے آپ کے سامنے قتل ہوں اور آپ کے جد بزرگوارؐ سے جا کر سب سے پہلے دست بوسی کروں۔

بہت سے لوگوں نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شہدائے کربلاؑ میں سب سے پہلے درجۂ شہادت پر فائز ہونے والے حُرؓ ہیں۔ سیدابن طاؤس نے لہوف میں ان الفاظ کی تاویل کی ہے کہ:

انما اراد اوّل قتیل من الآن لان جماعۃ قتلوا قبلہ کما ورد

سب سے پہلے قتل ہونے سے یہ مراد تھی کہ اب اس وقت سے وہ سب سے پہلے قتل ہونے والے ہوں کیونکہ ان کے پہلے بہت لوگ قتل ہو چکے تھے جیسا کہ روایات میں

لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ حُر کے مذکورہ بالا الفاظ اس تاویل سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے۔ علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:۔ المعنی یکون اوّل قتیل من المبارزین الّا فانّ جماعۃ کانوا قد قتلوا فی الحملۃ الاولیٰ۔

معنی ان الفاظ کے یہ ہیں کہ وہ سب سے پہلے قتل ہونیوالے ہوں مبارز طلبی کی صورت میں مرنے والے اول ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان کے پہلے قتل ہو چکے تھے پہلے حملہ میں۔

اس میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حُر کے الفاظ میں "مبارزین" کی بالکل قید نہیں ہے بلکہ انکا یہ کہنا کہ "سب سے پہلے آپ کے جد بزرگوار سے جاکر مصافحہ کروں" صاف بتلاتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضری کیلئے یہ شرط نہیں ہے کہ بطور مبارزہ طلبی شہید ہو بلکہ جنگ مغلوبہ یا تیروں کے حملہ میں شہید ہونیوالے بھی حضرؐ کی خدمت میں شرفیابی کے مستحق ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مجلسیؒ کا یہ قول اُسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ "حملۂ اولیٰ" جس میں پچاس آدمی شہید ہوئے وہ جنگ کی آغاز والی تیراندازی ہی کا نام ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

حقیقتہً حُر کے الفاظ بالکل حقیقت پر محمول ہیں۔ حُر کی اس اجازت جہاد کے پہلے ہرگز کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ حُر ہی شہدائے کربلا میں سب سے پہلی فرد ہیں۔

حُر نے جنگ کی اجازت اسی خیال سے مانگی کہ وہ جائیں گے اور لڑیں گے اور شہید ہوں گے تو اس صورت میں اوّل شہید قرار پائیں گے۔ اور انھیں اجازت جہاد کی ملی بھی اور انھوں نے

حملہ بھی کیا لیکن اس حملہ میں وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ صرف اُن کا گھوڑا زخمی ہوا اور شہید وہ اس کے بعد چند دوسرے اصحاب کی شہادت کے بعد ہوئے ہیں جس کا تذکرہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آئے گا۔

حُر کو امامؑ نے اجازت دی وہ میدان جنگ میں آئے اور یہ اشعار رجز میں پڑھنے لگے:

انّی انا الحرّ ومأوی الضّیف — اضرب فی اعناقکم بالسیف

عن خیر من حل بارض الخیف — اضربکم ولا اری من حیف

"میں حُر ہوں اور مہمانوں کا پناہ دینے والا ہوں۔ میں تمہاری گردنوں پر تلوار چلاؤں گا اُس امامؑ کی جانب سے جو سر زمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے، میں تم کو تلواریں لگاؤں گا اور اس کو ذرا بھی ظلم و تعدّی نہ سمجھوں گا۔"

اس کے بعد حملہ کیا اور شمشیر زنی شروع کر دی۔ اس کے پہلے اُس وقت جب حُر لشکر عمر سعد سے جدا ہو کر امامؑ سے جا کر ملے ہیں تو یزیدی فوج کے ایک سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا کہ اگر میں حُر کو دیکھ لیتا اُس وقت جب وہ لشکر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک نیزہ میں اُس کا کام تمام کرتا۔ اب جو حُر نے حملہ کیا اور چاروں طرف تلواریں چلانا شروع کیں، لوگ سامنے سے ہٹ رہے تھے اور دور دور سے وار کرتے تھے حُر کی ز[illegible]

یہ شعر تھا کہ:-

مازلت ارمیھم بثغرۃ نحرہ ولبانہ حتیٰ تسربل بالدم

"میں برابر ان پر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اُس کے سینہ کو یہاں تک کہ اُس نے سر سے پاؤں تک خون کی چادر اوڑھ لی"۔

حُر کا گھوڑا زخمی ہو گیا تھا اور اس کے سر اور چہرہ پر تلواریں پڑی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت حصین بن تمیم مشہور یزیدی افسر نے یزید بن سفیان سے کہا کہ دیکھو حُر یہی تو ہے جس کو قتل کرنے کی تم کو آرزو تھی۔

یہ سُن کر یزید کو جوش آ گیا۔ نکلا اور حُر کو آواز دی کہ کیا مجھ سے لڑنا منظور رہے؟ حُر نے کہا ہاں ضرور۔ یہ کہہ کر سامنے آ گئے خود حصین کا قول بیان کیا گیا ہے کہ بس یہ معلوم ہوا جیسے یزید کی جان حُر کے قبضہ میں ہی تھی۔ ادھر سامنے پہونچے اور بس قتل ہو گیا۔ اس منظر کی ہیبت تھی کہ دشمن کا پرا بند ہو گیا اور پھر حُر کے مقابلہ کو کوئی نہیں نکلا۔ حُر اپنے گھوڑے کو جو زخمی ہو چکا تھا موڑ کر اپنے مرکز کی جانب واپس آ گئے۔

نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر لڑائی کا آغاز کیا اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ انا الجملی انا علی دین علی۔

"میں قبیلۂ بنی جمل میں سے ہوں میں علیؑ کے دین پر ہوں"۔ اُن کے

مقابلہ میں ایک شخص آیا جس کا نام تھا مزاحم بن حریث۔ اُس نے کہا میں عثمان کے دین پر ہوں" نافع نے کہا تو شیطان کے دین پر ہے" یہ کہہ کر حملہ کیا اور اُسے قتل کر دیا۔

ان پیہم نقصانات سے جو فوج مخالف کو برابر ہوئے تھے سرداران فوج پریشان ہو گئے۔ عمرو بن الحجاج نے جو اس کے پہلے بھی ایک حملہ کر چکا تھا اور ناکام واپس گیا تھا، فوراً زور سے فوج کو للکارا اور بلند آواز سے کہا:

یا حمقی اتدرون من تقاتلون
فرسان المصر قوماً مستمیتین
لایبرزن لھم احد منکم
فانھم قلیل وقل ما یبقون
واللہ لو لم ترموھم الا
بالحجارۃ لقتلتموھم

اے بے وقوفو! یہ تم جانتے ہو کس سے جنگ کر رہے ہو۔ یہ ملک کے خاص شہسوار لوگ ہیں۔ یہ جانوں پر کھیلے ہوئے لوگ ہیں تم میں سے کوئی شخص انفرادی طور پر ان سے جنگ کے لیے نہ نکلے مگر اُن کی تعداد کم ہے۔ یہ بہت تھوڑی دیر زندہ رہ سکتے ہیں اگر تم سب مل کر فقط پتھر ہی ان پر برساؤ تب بھی ان کو قتل کر سکتے ہو۔"

یہ مشورہ عمر سعد کو بھی پسند آیا اور تمام فوج کو فرمان پہونچا دیا گیا کہ کوئی شخص مبارز طلبی کے لیے میدان میں نہ نکلے۔ بے شک

ـــــــــــــــ
۵ طبری ج ۶ صہ ۲۴۹

عمرو بن حجاج نے آگے بڑھ کر فوج میں جوش پیدا کرنے کے واسطے تقریر کی اور کہا:۔

یا اھل الکوفۃ الزموا طاعتکم ولا ترتابوا فی قتل من مرق من الدین وخالف الامام۔

اے اہل کوفہ اطاعت اور وفاداری کے پابند رہو اور اپنی جماعت سے الگ نہ ہو اور ذرا بھی شک وشبہہ نہ کرو ان لوگوں کے قتل کے بارے میں جو دین سے نکل گئے ہیں اور امام وقت (یزید) کے مخالف ہیں۔

امام حسینؑ نے یہ گمراہ کن الفاظ سُن کر جوابی تقریر ضروری سمجھی اور ارشاد کیا:۔

یا عمر بن الحجاج اعلیّ تحرض الناس انحن مرقنا وانتم ثبتّم علیه اما واللّٰه لتعلمن لو قد قبضت اروا حکم ومتم علی اعما لکم اینا مرق من الدّین ومن ھو اولی بصلی النّار۔

اے عمرو بن حجاج تو لوگوں کو میرے خلاف آمادہ کرتا ہے؟ کیا ہم دین سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم ہو۔ قسم خدا کی عنقریب معلوم ہو گا اُس وقت جب کہ تمہاری جانیں ان جسموں سے جدا ہوں اور تم اپنے ان اعمال پر دنیا سے جاؤ اُس وقت معلوم ہو گا کہ کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنّم میں جلنے کا مستحق تھا۔

عمرو بن الحجاج نے اپنی فوج کو آمادہ کر لیا تھا اور اب کی پورے جوش و خروش سے عمر سعد کی فوج کے میمنہ کے ساتھ فرات کی جانب سے فوج امام حسینؑ پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں مسلم بن عوسجہؓ امامؑ کی فوج میں سب سے پہلے شخص زخمی ہو کر زمین پر گرے۔ چھوٹی فوج کے چھوٹے سے میسرہ نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو واپس جانا پڑا مگر غبار کا دامن جو چاک ہوا تو ابن عوسجہؓ خاک و خون میں آغشتہ نظر آئے۔ امام حسینؑ مسلم کے سرہانے گئے۔ دیکھا ایک رمق حیات باقی ہے۔ حضرت نے مسلم کے لیے دعائے خیر کی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ:

منھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔

"کچھ جانے والے گذر گئے اور کچھ وقت کے منتظر ہیں اور کسی نے اپنی بات میں تبدیلی نہیں کی۔"

حبیب بن مظاہرؓ جو امامؑ کے ساتھ ساتھ تھے، وہ مسلمؓ کے قریب گئے۔ کہا تمہارے قتل ہونے کا بڑا صدمہ ہے، مگر تمھیں جنت کی مبارک باد دیتا ہوں۔ مسلمؓ نے کمزور آواز سے کہا۔ "تمھیں بھی ہر طرح کی خیر و برکت کی مبارک باد قبول ہو۔"

اس کا نام ہے استقلال، اس کا نام ہے ثبات قدم، اس کا نام ہے اصول پر جان دینا اور اصول کو آخر وقت تک مد نظر رکھنا،

حبیبؓ نے کہا "اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی عنقریب تمہارے ہی پیچھے پیچھے آتا ہوں تو میں یہ کہتا کہ کچھ وصیت کرو اور میں اس وصیت کو پورا کروں۔" مسلمؓ نے کہا وصیت کچھ بھی نہیں، وصیت جو کچھ ہے وہ اسی ذات کے متعلق (اشارہ کیا حسینؑ کی طرف) کہ تم بھی انہی کے سامنے اپنی جان نثار کرنا۔ حبیبؓ نے کہا ضرور خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا۔"

عمر سعد کی بدحواس فوج اس مختصر سی جماعت کے مقابلہ سے بے تحاشا بھاگی تھی، اُسے خبر بھی نہیں تھی کہ کون قتل ہوا لیکن مسلم بن عوسجہؓ کے اہل و عیال ان کے ساتھ تھے، خیمہ میں جو اُن کے قتل کی خبر پہونچی تو ایک کنیز نے چیخ مار کر کہا یا ابن عوسجتاہ، یا سیّداہ "ہائے ابن عوسجہ، ہائے میرے مالک"۔ یہ سننا تھا کہ عمرو بن الحجاج کی فوج والوں نے خوشی کا شور بلند کیا کہ ہم نے مسلم بن عوسجہؓ کو قتل کر دیا۔

شبث بن ربعی نے جو خود فوج عمر سعد میں تھا اپنے گرد و پیش والوں سے کہا کہ

"خدا تم لوگوں کو غارت کرے۔ تم اپنے ہاتھ سے اپنی مٹی خراب کر رہے ہو، تم اس بات پر خوش ہوتے ہو کہ مسلم بن عوسجہ ایسے شخص کو قتل کر دیا۔ قسم اُسی خدا کی جس کا میں اسلام رکھتا ہوں کہ میں نے کتنی ہی مرتبہ انہی مسلم کو اسلامی جہاد کے موقعوں پر

کارنمایاں کرتے دیکھا۔ ایک آذربایجان ہی کا جہاد تھا جس میں چھ مشرکوں کو قتل کیا۔ کیا ایسا شخص تمہارے ہاتھ سے مارا جائے اور تم خوشیاں کرو۔"

یہ سچائی کا مخصوص جوہر ہے کہ وہ دشمن کی زبان سے بھی ظاہر ہو جائے۔ مسلم بن عوسجہؓ کے قتل کرنے والے دو شخص بتلائے جاتے ہیں۔ مسلم بن عبد اللہ ضبابی اور عبد اللہ بن ابی خشکارہ بجلی۔

میمنہ والے حملہ کی اس کامیابی نے جو قتل مسلمؓ کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی فوج کا دل بڑھا دیا تھا اس لیے اب کی شمر بن ذی الجوشن نے میسرہ فوج کو لے کر حملہ کیا۔ اس طرف بھی اصحاب امام حسینؑ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ عبد اللہ بن عمیر نے جو اس کے قبل ایک حملہ کر کے اپنی شجاعت دکھلا چکے تھے اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا اور دو آدمی اور قتل کیے، جس کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی اور بکیر بن حی تیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ طبری کی تصریح ہے کان القتیل الثانی من اصحاب الحسینؑ۔

"یہ اصحاب امام حسینؑ میں سے دوسرے بزرگ تھے جو شہید ہوئے۔"

ان کی زوجہ ام وہب جو پہلے ہی سے بے چین ہو کر ایک مرتبہ میدان جنگ میں نکل چکی تھی اب اپنے شوہر کے قتل ہونے کے بعد پھر بے تحاشا میدان میں آگئی اور شوہر کے سرہانے بیٹھ کر

خاک و خون سر سے پاک کرنے لگی اور کہہ رہی تھی کہ "ھنیئالک الجنۃ۔" بہشت کی مبارک باد قبول کرو۔"

شمر بن ذی الجوشن نے اپنے غلام رستم کو اشارہ کیا کہ گرز اس کے سر پر مار دے، اُس نے گرز لگایا اور وہ باوفا عورت اُسی جگہ شوہر کے سامنے ہی تمام ہو گئی۔

یہ واقعۂ کربلا کے سلسلہ کی وہ شرم ناک وارداتیں ہیں جن پر تاریخ ہمیشہ خجالت سے سر جھکا لیا کرے گی اور انسانیت کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہو گی۔

حسینؑ بن علیؑ کی فوج والے بہادر سپاہی جن میں سوار صرف ۳۲ تھے بڑی پُر جگری سے دشمن کی فوج میں ڈوب ڈوب کر لڑ رہے تھے اور جس طرف رُخ کرتے تھے اہل کوفہ کا موج مارتا ہوا فوج کا سمندر اس طرح پیچھے ہٹ جاتا تھا جیسے بڑھتے ہوئے دریا میں جزر کے وقت کمی پیدا ہو۔ لیکن ان حملوں میں اصحاب سید الشہداءؑ میں سے بھی بعض افراد برابر کام آرہے تھے جن میں سے حسب ذیل اشخاص کے نام اب بھی محفوظ ہیں:-

(۱) منجح بن سہم مولی الحسنؑ، بعض روایتوں میں ہے کہ امام حسینؑ کے غلام تھے، حدیقۂ وردیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ انھیں حسان بن بکر حنظلی نے اوائل جنگ میں قتل کیا۔ (۲) عمرو بن خالد اسدی صیداوی۔ (۳) سعد مولی عمرو بن خالد (۴) مجمع بن عبد اللہ عائذی۔

(۵) عائذ بن مجمع بن عبداللہ (۶) جنادۃ بن حارث سلمانی۔
یہ پانچوں آدمی ایک ہی ساتھ نصرت امام حسینؑ کے لیے آئے تھے اور جنگ چھڑنے کے بعد ایک ہی ساتھ فوج دشمن پر حملہ آور ہوئے اور زور و شور سے حملہ کیا، لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے۔ فوج کوفہ نے ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لشکر امامؑ سے بالکل الگ کر دیا۔ یہ دیکھ کر امامؑ نے اپنے بھائی جناب عباسؑ کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ آپ نے جا کر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چلانا شروع کی۔ یہاں تک کہ فوج کو منتشر کیا اور ان زخمی بہادروں کو دشمنوں کے حلقہ سے نکال کر اپنی فوج کی طرف لے چلے، ابھی راستہ پورا طے نہیں ہوا تھا کہ دشمن کی فوج پیچھے تعاقب کے لیے آتی نظر آئی اور وہ قریب پہونچ گئی۔ حضرت عباسؑ ان لوگوں کو لیے آگے آگے بیے خود بطور حفاظت پیچھے پیچھے چلے تا کہ اُن کو کوئی گزند پہونچنے نہ پائے مگر دشمن کی فوج کے قریب آتے ہی زخمی بہادروں کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ حضرت عباسؑ کی حفاظت سے نکل کر دشمنوں پر جھپٹ پڑے اور باوجودیکہ زخموں سے بالکل بے حال تھے لیکن جان توڑ شمشیر زنی کی اور آخر ایک ہی جگہ پر گرے اور شہید ہو گئے۔ جناب عباسؑ مجبوراً امامؑ کی خدمت میں واپس آئے اور واقعہ کی اطلاع دی، امامؑ نے چند بار اُن بہادروں کے لیے دعائے رحمت کی۔

اس واقعہ میں چند خاص قابلِ توجہ اُمور ہیں :-

(الف) امامؑ کا بحیثیت ایک سپہ سالارِ فوج کے اس درجہ اپنے سپاہیوں کا قدرشناس ہونا کہ جب وہ دشمنوں میں گھر گئے تو آپ نے کسی اور کو نہیں اپنے عزیز ترین بھائی اور علمدارِ لشکر حضرت عباسؑ کو اُن کی امداد کے لیے بھیجا۔

(ب) امامؑ کا انتہائی بھروسا اپنے بھائی جناب عباسؑ کی شجاعت وقوت پر کہ پانچ بہادروں کی امداد کے لیے جو دشمن میں گھرے ہوئے تھے ایک عباسؑ کو بھیجا گیا اور کوئی اندیشہ نہیں کیا۔

(ج) حضرت عباسؑ کی مخصوص شجاعت اور فنِ جنگ میں مہارت جس کی بنا پر آپ نے جوشِ غضب میں بھرے ہوئے اور اپنے قبضہ میں آئے ہوئے شکار پر اپنی فتح مندی کے ولولے رکھنے والی کثیر التعداد فوج پر تن تنہا حملہ کیا اور حلقۂ دشمن میں گھرے ہوئے بہادروں سے دشمنوں کو ہٹا دیا، بہادروں کو اُن کے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور پھر کسی حیثیت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ آپ کو اس حملہ میں کوئی بھی گزند پہونچا ہو اور زخم لگا ہو۔

(د) اُن بہادروں کا جوشِ جنگ اور ولولۂ شہادت جس سے بروقت امداد پہونچنے کے باوجود اُنھوں نے پھر اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا اور آخر لڑ بھڑ کر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

ان لوگوں کی شہادت کے متعلق علامہ شیخ محمد سماوی نے اپنی کتاب (ابصار العین فی انصار الحسینؑ) میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:۔

ذلک قبل الحملۃ الاولیٰ فی اول القتال "یہ پہلے حملہ کے قبل ابتدائے جنگ کا واقعہ ہے۔"

---

(۷) جندب بن حجیر کندی، انکی بھی شہادت جنگ کے ابتدائی اوقات ہی میں ہوئی ہے۔ حدائق وردیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان کے بیٹے حجیر بن جندب بھی انہی کے ساتھ قتل ہوئے لیکن یہ امر پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچا ہے۔ اُن زیارتوں میں جو امام عصر عجل اللہ فرجہ سے وارد ہیں اور اصحاب سید الشہداءؑ کے تذکرہ پر مشتمل ہیں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

اٹھارہواں باب

سب سے پہلا سخت حملہ

اور

معرکۂ جنگ کی شدّت

واقعی تاریخ کا ایک یادگار اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تیس ہزار فوج کے سامنے ۷۲ بھوکے اور پیاسے ہوں اور وہ فوج کثیر اس عدد قلیل سے نقصان پر نقصان اُٹھائے اور شکست پر شکست برداشت کرے اور اُس کے بنائے کچھ نہ بنے۔ صبح سے دوپہر کے قریب کا وقت آجائے اور حسینی فوج کی صف مثل ایک مضبوط و محکم آہنیں دیوار کے سامنے موجود رہے۔ اس کے برخلاف فوج مخالف میں اضطراب ہو۔ اُن کے نظم و نسق اور بند و بست میں برہمی ہو اور وہ طریقہ جنگ میں کسی ایک صورت پر برقرار نہ رہ سکیں۔

طبری کا بیان ہے:-

قاتلهم اصحاب الحسین قتالا شدیدا — اصحاب حسینؑ نے سخت جنگ کی

واخذت خیلهم تحمل
وانما هم اثنان وثلثون
فارسا واخذت لا تحمل
على جانب من اهل الكوفة
الا كشفته فلما رای
ذلك عزرة بن قیس وهو
على خیل اهل الكوفة
ان خیله تنكشف من كل
جانب بعث الى عمر بن سعد
عبد الرحمن بن حصن
فقال اما ترى ما تلقى خیلی
مذ الیوم من هذه العدة
الیسیرة ابعث الیهم
الرجال والرماة.

اور ان کی سوار فوج جو صرف
۳۲ سپاہیوں پر مشتمل تھی اُس
نے تابڑ توڑ حملے کیے اور وہ اہل کوفہ
پر جس طرف سے حملہ کرتے تھے
اس طرف کی فوج کو منتشر کر دیتے
تھے جب عزرہ بن قیس نے جو
اہل کوفہ کی تمام سواروں کی
فوج کا افسر تھا یہ دیکھا کہ اُس
کی فوج ہر جانب سے منتشر
ہوتی جاتی ہے تو اُس نے
عمر بن سعد کے پاس عبدالرحمن
بن حصن کو یہ پیغام دے کر
بھیجا کہ آپ دیکھتے ہیں آج
صبح سے اس چھوٹی جماعت کے
ہاتھ سے میری فوج کی کیا حالت ہے، اب آپ پیادوں کی فوج اور
تیر اندازوں کو بھیجئے کہ وہ مقابلہ کریں۔"

شرم ہے اور بہت سخت شرم۔ شکست کا اعلان اور بہت
کھلا ہوا اعلان۔ شکست اور کسی شرمناک شکست سواروں کا
افسر ہمت ہار چکا۔ اب پیادوں کی باری آئی۔ شبث بن ربعی

پیادہ فوج کا افسر تھا۔

سپہ سالار اعظم عمر سعد کا پیغام پہونچا کر تم آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ دل پر چھایا ہوا رعب سمجھئے یا فوج حسینی کی رعایت۔ نیک دل حسن ظن رکھنے والے راویوں کا یہ بیان ہے کہ شبث بن ربعی کو حسین بن علیؑ سے لڑنا اپنے ضمیر کے لحاظ سے بہت ناگوار تھا اس لیے کہ اُس نے جان بچائی مگر حقیقت حال کچھ اور کہتی ہے۔ بہر حال اُس نے صاف جواب دیا مگر اپنی شان خودداری کو محفوظ رکھنے کے پردہ میں کہا اور کتنے حقارت آمیز الفاظ میں کہا کہ افسوس ہے ایسی مہم کے سر کرنے کو اتنی فوج ناکافی سمجھی جائے اور مجھے جو ایک بڑا سردار ہوں زحمت دی جائے اور پھر تیراندازوں کی بھی ضرورت ہو؟ کیا میرے سوا اور کوئی اس مہم کے لیے نہیں ملتا۔

عمر سعد نے مجبور ہو کر حصین بن تمیم۔ وہی حصین جو قادسیہ کی فوج کا افسر تھا۔ وہی جس کے متعلق ہم نے متعدد بار اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ لوگ غلطی سے حصین بن نمیر کہتے ہیں اور یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اسی افسر کو اُسی فوج کے ساتھ جو قادسیہ کی سرحد میں تھی اور اُس کے ساتھ پانچ سو تیراندازوں کو مامور کیا کہ وہ بڑھیں اور حسینؑ بن علیؑ کی فوج کے قریب جا کر پاس سے تیروں کا مینھ برسا دیں۔

فن جنگ کے واقف کار اس امر سے واقف ہیں کہ تیروں کی زد کے لیے خاص درجہ کی مسافت ضروری ہے۔ دور کی تیراندازی جو مقررہ فاصلہ سے زیادہ پر ہو ہوائی فیروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گزند نہ پہونچنا بہت آسان ہے لیکن قریب کی مسافت سے تیروں کا ہنگامہ خیز طوفان ایک بے پناہ حملہ ہے جس سے محفوظ رہنے کے لیے نہ فنون جنگ کام دے سکتے ہیں نہ شجاعت و جرأت کے حوصلے۔

یہ ظاہر ہے کہ اصل لشکرگاہ دونوں جماعتوں کے ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر ہوتے ہیں، اور اسی صورت سے کربلا میں بھی تھے۔ دونوں فوجوں کی صف آرائی ایسی ایسی جگہوں پر ہوتی ہے جن کے درمیان بہت بڑا میدان معرکۂ جنگ اور میدان کارزار کی صورت میں موجود ہوتا ہے اور وہ کچھ کم مسافت نہیں ہوتی۔

پہلی مرتبہ کے تیروں کی بارش کا عنوان یہ تھا کہ عمر سعد نے اپنے لشکر ہی سے جس کی صف آرائی مکمل ہوی تھی تیر چلایا اور اس کے ساتھ فوج کے دوسرے لوگوں نے بھی تیر رہا کیے مگر ان تیروں کا اثر فوج حسینی پر کچھ نہیں پڑا اور نہ پڑنا چاہیئے تھا سوا اس کے کہ اعلان حرب ہو جائے اور عملی طور سے آغاز جنگ۔

مگر اب جو تیراندازی ہو رہی ہے اس کی نوعیت مختلف ہے یہ تیروں کا حملہ ہے جو پورے طور سے زد پر لا کر کیا جا رہا ہے۔

تیر کا بچاؤ ڈھال نہیں ہے۔ تیر کا جواب نیزہ و شمشیر کوئی بھی نہیں ہے۔ تیر کا بچاؤ خالی دینا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ تو دیکھنا چاہیے کہ یہ بچاؤ اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب اتنی دور میں کہ جس میں ایک انسان کھڑا ہو سکتا ہے یا ادھر اُدھر ہو سکتا ہے کوئی بھی جگہ تیر کی زد سے خالی ہو لیکن عالم تصوّر میں اس منظر کو پیش کیجیے کہ صرف ۷۲ آدمیوں کی صف ایستادہ ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کے لیے کس قدر مسافت کی ضرورت ہے؟ اس کے سامنے پانچ سو یا ایک ہزار کی جماعت آتی ہے تو وہ اس پہلی جماعت سے کتنی زیادہ دور تک، کتنی زیادہ مسافت تک ایستادہ ہوگی پھر اس بڑے لشکر کی طرف سے یک مرتبہ مجموعی طور پر یکجہت اور ہم آہنگ ہو کر ایک نشانہ پر، ایک ہی مقصد پر یعنی اس پہلی جماعت کی صف کو پیش نظر رکھ کر بہت دور سے نہیں بلکہ اتنی دور سے جو اُن کی زد میں لانے کے لیے ضروری ہو بوقت واحد تیر چلیں تو کیا یہ ایک عظیم سیلاب کا بہاؤ۔ ایک بڑے طوفان کا تھپیڑا۔ ایک بڑی آندھی کا جھکڑ۔ لوہے کی ایک بڑی چادر نہ ہوگی جو تیروں کی صورت میں چپ و راست ہر طرف سے اس مختصر جماعت کو ڈھانپ لے گی اور اُن کے جسم کے کسی حصّہ اور داہنے بائیں کے کسی گوشہ میں بھی ایسا نقطہ نہیں ہو سکتا جو ان تیروں کی زد سے خالی ہو اور اس مختصر جماعت کے لیے

امن و اماں کا ذریعہ ہو۔

مگر واہ رے انصار سیّد الشہداء۔ اس عظیم الشان تیروں کے سیلاب کا جواب اُن کی طرف سے صرف یہی تھا کہ اُنھوں نے تلواریں سوت لیں۔ تیروں کے آتے ہوئے طوفان کا اپنے سینوں سے مقابلہ کرتے اور اُس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو ریلتے ہوئے جا پڑے اور دشمن کی فوج کے اندر گھس گئے اور شمشیر زنی کرنے لگے۔

یہی ہے وہ عظیم الشان حملہ اور گھمسان کی جنگ جو تاریخوں میں "حملۂ اولیٰ" کے نام سے مذکور ہے اور یہ ظہر کے ایک گھنٹہ قبل ہوئی تھی۔

کیا کہنا اُس قیامت خیز بہادری کا جس نے آخر میں پھر دشمن کو شکست دی اور فوج کو پسپا کیا مگر نتیجہ اس حملہ کا فوج حسینی کے لیے بہت دردانگیز تھا۔

جس وقت میدان صاف ہوا اور گرد و غبار دور ہوا تو معلوم ہوا کہ مختصر تعداد بہت مختصر ہو گئی ہے، پچاس آدمی انصار سیّد الشہداءؑ میں سے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے ہیں جن میں سے بعض تیروں کے نشانہ تھے اور بعض جنگ مغلوبہ میں لڑ بھڑ کر شہید ہوئے، یہ سب وہ ہیں جن کی نسبت تاریخ میں یہ ملتا ہے کہ قتلوا فی الحملۃ الاولیٰ "یہ پہلے حملہ میں شہید ہوئے۔"

اس کے علاوہ جتنے گھوڑے اصحاب سیّد الشہداء کی سواری میں تھے سب کے سب پے ہو گئے اور اصحاب جو سوار تھے وہ بھی اب پیادہ ہو گئے۔ حُر بن یزید ریاحیؓ جن کا گھوڑا زخمی اس کے پہلے ہو چکا تھا وہ بھی اس موقع پر بالکل پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ اُن کے دشمن ایوب بن مشرح حیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ:-

انا واللّٰہ عقرت بالحرّ بن یزید فرسہ حشأتہ سہما فما لبث ان ارعد الفرس واضطرب وکبا فوثب عنہ الحرّ کانّہ لیث والسیف فی یدہ وھو لقول :-
ان تعقروا بی فانا ابن الحرّ
اشجع من ذی لبد ھزبر
قال فما رایت احدا یفری فریہ۔

میں وہ تھا جس نے حر بن یزید کے گھوڑے کو پے کیا۔ بس ایک تیر ایسا لگایا کہ فرس تھرا کر زمین پر آیا اور حُر چھلانگ مار کر اُس کی پشت سے زمین پر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر ہے اور تلوار ہاتھ میں لیے تھے۔ یہ شعر پڑھ رہے تھے اگر تم نے میرا گھوڑا پے کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں، میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں اور شیر سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں (راوی کا بیان ہے کہ) میں نے کوئی اس طرح کا شمشیر زنی کرنے والا نہیں دیکھا۔

واقعہ کربلا کے بعض نکات یقیناً عقل انسانی کو حیران کرنے والے ہیں۔ حسین بن علیؑ اور ان کے اصحاب کا اصول جنگ اور فن سپہ گری وہ ایک کارنامہ ہے جس کے رموز و اسرار تک عقل پہونچتی نہیں۔

کربلا میں حسینی فوج کی صف بندی کس طرح ہوئی تھی۔ نظم فوج کیونکر درست کیا گیا تھا۔ اور ترتیب کیا تھی؟

آخر اس طرح کی خوں ریز لڑائیاں، اس صورت کی عظیم الشان تیر اندازی، ایسا ہنگامہ خیز حملہ، گھمسان کی لڑائی اور جنگ مغلوبہ مگر حیرت، انتہائی حیرت۔ سخت حیرت ہے کہ اصحاب و انصارؓ نے کس طرح کا انتظام کیا تھا کہ پچاس صحابی تمام ہو گئے۔ گھوڑے سب کے سب پے ہو گئے۔ میدان خون شہداءؑ سے لالہ زار بن گیا اور شمع امامت کے پروانے آتش ظلم کی نذر ہو گئے۔ مگر یہ کیا؟ کوئی ایک تیر، ایک معمولی زخم کسی ایک ہاشمی جوان، نوجوان، کسی بچہ تک کے آیا ہو۔ اور علوی، حسنی، حسینی، عقیلی، جعفری کسی ایک خاندان کا کوئی ایک شخص بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوا ہو ہرگز نہیں (غیر ممکن) دنیا کی کوئی تاریخ اس کے بتلانے پر تیار نہیں۔ ایک راوی بھی اس کو ظاہر نہیں کرتا۔

کیا حسین بن علیؑ اور ہاشمی جوان میدان جنگ میں موجود نہیں تھے؟ یہ کہنا بھی بالکل واقعات کے خلاف ہے۔ پھر کیا تھا؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ بہادر مقابلہ کر رہے تھے۔ اپنی جان

دے رہے تھے اور دوسری طرف اپنے سرداروں اور آقازادوں
کی حفاظت کر رہے تھے اور کامیاب حفاظت اور یہی فداکارانہ
اور وفادارانہ عزم و ارادہ کی طاقت وہ نمایاں پہلو ہیں جن کی
مثال واقعۂ کربلا کے سوا ملنا غیر ممکن ہے۔

یہ تصریح اکثر مورخین نے کی ہے کہ اس حملہ میں شہید ہونے
والوں کی تعداد پچاس تک پہونچتی ہے۔
مایوسی معلوم ہوتی تھی کہ ان تمام شہداءؑ کے اسماء مکمل طور
سے معلوم ہو سکیں اور حقیقتاً وہ یکجا صورت سے کہیں مذکور
ہیں بھی نہیں مگر قدر ہوئی جستجو اور سعی کے کامیاب نتیجہ کی جب
تلاش کے بعد میں نے ان تمام انصار کے اسماء یکجا مجتمع کیے اور
شمار کرنے پر پچاس۵۰ کی تعداد پوری ہوگئی، ملاحظہ ہو:-

"پہلے حملہ" میں شہید ہونے والے اصحابؑ کے اسماء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

(۱) ادہم بن اُمیہ عبدی بصری
(۲) اُمیہ بن سعد بن زید طائی
(۳) بشر بن عمرو بن احدوث
حضرمی کن[illegible]

(۴) جابر بن حجاج مولی عامر
بن نہشل التیمی
(۵) جبلہ بن علی الشیبانی۔

(۶) جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی
(۷) جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تمیمی
(۸) حارث بن امرار القیس بن عابس کندی
(۹) حارث بن نبہان مولی حمزۃ بن عبدالمطلب
(۱۰) حباب بن عامر بن کعب التیمی
(۱۱) حبشی بن قیس النہمی
(۱۲) حجاج بن بدر التمیمی السعدی
(۱۳) حلاس بن عمرو الازدی الراسبی
(۱۴) زاہر بن عمرو الکندی
(۱۵) زہیر بن سلیم بن عمرو الازدی
(۱۶) سالم بن عمرو بن عبداللہ مولی بنی المدنیۃ الکلبی
(۱۷) سالم مولی عامر بن مسلم العبدی
(۱۸) سعد بن حارث مولیٰ علی بن ابی طالب علیہ السلام
(۱۹) سعد بن عبداللہ مولی عمر بن خالد الاسدی الصیداوی
(۲۰) سلمان بن مضارب بن قیس
(۲۱) سلیم مولی الحسنؑ
(۲۲) سوار بن منعم بن حابس النہمی الہمدانی
(۲۳) شبیب بن عبداللہ مولی حارث بن سریع الہمدانی الجابری
(۲۴) شبیب بن عبداللہ النہشلی البصری
(۲۵) عامر بن مسلم بن حسان بن شریح السعدی البصری
(۲۶) عامر بن مسلم العبدی البصری
(۲۷) عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر الجہنی
(۲۸) عبدالرحمٰن بن عبداللہ الارحبی
(۲۹) عبدالرحمٰن بن مسعود بن حجاج التیمی
(۳۰) عبداللہ بن بشر الخثعمی

(۳۱) عبد اللہ بن یزید بن ثبیط القیسی العبدی البصری

(۳۲) عبید اللہ بن یزید بن ثبیط القیسی

(۳۳) عقبہ بن الصلت الجہنی

(۳۴) عمارۃ بن ابی سلامۃ الدالانی

(۳۵) عمار بن حسان بن شریح الطائی

(۳۶) عمر بن ضبیعۃ بن قیس بن ثعلبۃ التیمی

(۳۷) عمرو بن جندب الحضرمی

(۳۸) قارب بن عبد اللہ بن اریقط اللیثی الدؤلی

(۳۹) قاسط بن عبد اللہ بن زہیر بن حارث التغلبی

(۴۰) قاسم بن حبیب بن ابی البشر الازدی

(۴۱) کردوس بن عبد اللہ بن زہیر التغلبی

(۴۲) مالک بن سریع

(۴۳) مجمع بن زیاد بن عمرو الجہنی

(۴۴) مسعود بن حجاج التیمی

(۴۵) مسلم بن کثیر الاعرج الازدی

(۴۶) مقسط بن عبد اللہ بن زہیر التغلبی

(۴۷) منیع بن زیاد

(۴۸) نصر بن ابی نیزر مولیٰ علی بن ابی طالب علیہ السلام

(۴۹) نعمان بن عمرو الازدی الراسبی

(۵۰) نعیم بن عجلان الانصاری الزرقی الخزرجی۔

یہ وہ لوگ ہیں جن میں یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کون پہلے شہید ہوا اور کون بعد میں اس لیے کہ تیروں کی بارش اور گھمسان کی جنگ میں ترتیب قائم ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

۱۹
اُنیسواں باب

خیمہ گاہِ حُسینی پر فوج کا ہُجوم

اور

اصحاب سیدالشہداءؑ کی بے مثال شجاعت

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ حسینؑ اُس باپ کے بیٹے تھے جس کی عمر نوجوانی سے بڑھاپے تک میدان جنگ میں گزری۔
مگر خود امام حسینؑ نے کربلا میں جس طرح کی سپہ سالاری اور سیاست جنگ کا نمونہ پیش کیا ہے وہ اُن کے پہلے خود اسلام کی تاریخ میں بھی موجود نہیں ہے۔

گفتگوئے صلح کے قطع ہونے کے بعد جنگ کا یقین ہو چکا تھا امامؑ کے ساتھ عورتیں تھیں اور بچے بھی تھے۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد انتہائی کم تھی اور دشمن کی سپاہ حد سے زیادہ تھی۔ کوفہ میں عمومی اعلان کے بعد کہ جو قتل حسینؑ کے لیے نہ جائے گا اُس کا گھر گرا دیا جائے گا اور وہ خود قتل ہو گا۔ کوفہ کے ہر طرح ہی کے

لوگ کربلا میں جمع ہو گئے تھے۔

حضرت نے ملاحظہ فرمایا کہ اُن کا قیام کھلے ہوئے میدان میں دشمن کو چاروں طرف سے ہجوم کرنے کی دعوت دینا ہے اور اس صورت میں سراپردۂ حرم کی حفاظت بھی آپ کی زندگی ہی میں غیر ممکن ہے۔

یہ خیال کر کے آپ نے کربلا کی سرزمین پر تمام اطراف میں گردش کی۔ ایک خاص موقع لشکر گاہ اور حرم سرا کے لیے مناسب نظر آیا۔ جہاں تین جانب سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا مدور شکل سے اس طرح آکر ملتا تھا جس سے ہلال کی شکل پیدا ہو اسی کا نام "حائر" ہے۔ یقیناً جو شخص اس دائرہ میں آجائے وہ تین طرف سے محفوظ تو ضرور ہو جائے گا اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک قلعہ میں پناہ لے لے گا مگر یہ پناہ وہی لے سکتا ہے جس کے پاس کافی مقدار میں آب و طعام موجود ہو اور جو شخص سامان آب و طعام کا نہ رکھتا ہو وہ اس دائرہ میں محفوظ ہونا چاہیئے تو وہ گویا اپنے کو موت کے سپرد کر رہا ہے اس لیے کہ مشرقی جانب کے کھلے ہوئے حصہ پر دشمن ہجوم کر کے اُسے بالکل محصور کر دے گا اور بہت مختصر مدت میں بھوک اور پیاس سے اُس کی جان کو تلف کر سکے گا۔

عہ کتاب نہضۃ الحسین مصنفہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی

لیکن امام کو اس کے پہلو میں جنوب کی طرف ایک طولانی سلسلہ ٹیلوں کا ملا جو اُس پہلے موقع سے زیادہ مناسب صورت رکھتا تھا اس لیے کہ جو شخص اس کے دامن میں قیام کرے وہ شمال اور مغرب کی جانب سے چھوٹی پہاڑیوں میں محصور ہو گا اور مشرق و جنوب کی جانب وسیع میدان جنگ و جدال، اور حرب و ضرب کے لیے موجود ملے گا۔ حضرت نے اپنے حرم سرا اور خیمہ گاہ کے لیے اسی جگہ کو منتخب فرمایا اور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے قریب برپا کریں اور ہر خیمہ کی طنابوں کو دوسرے خیموں کی طنابوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک خندق کھدوا کر اُس میں لکڑیاں جمع کرا دی تھیں کہ اُن میں آگ دے دی جائے جس کی بنا پر اُس طرف سے دشمن کے ہجوم کا اندیشہ نہ رہے۔ یہ تمام تیاریاں شب عاشور تک مکمل ہو گئی تھیں۔ اور صبح کو اُس خندق میں آگ روشن کر بھی دی گئی، اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیرنے اور چار طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

جب تک حسینؑ کی فوج اپنی مختصر مقدار کے اعتبار سے زیادہ تعداد میں موجود تھی اُس وقت تک دشمنوں کو آگے بڑھنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب جس وقت کہ پچاس آدمی فوج حسینی

کے سب کے سب درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے اور جتنے انصار حسینؑ باقی رہے ہے اُن کے پاس گھوڑے نہ باقی رہے، سب پیادہ ہو گئے تو اب فوج دشمن کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ خیام حسینیؑ کے قریب آ گئے۔

حسینؑ کے اصحابؑ کی تعداد بہت کم تھی مگر اُن کی جنگ کا یہ عالم تھا کہ طبری نے لکھا ہے:۔

قاتلوهم حتی انتصف النهار اشد قتال خلقه الله۔

"انھوں نے جنگ کی یہاں تک کہ دوپہر کا وقت آ گیا۔ سخت ترین جنگ دنیا کی جو خدا نے خلق کی ہو"

یزیدی فوج کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح پس پشت سے حملہ کر سکے اور ان بہادروں کو گھیرے مگر پشت کی جانب ان کے خیمے تھے جنھیں امامؑ کے حکم سے اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور طناب اندر طناب قائم کیا گیا تھا کہ اُنھوں نے ایک مضبوط دیوار اور حصار کی شکل اختیار کر لی تھی اس لیے اس طرف سے حملہ غیر ممکن تھا۔

عمر سعد نے یہ دیکھا تو حکم دیا کہ خیموں کو اُن کے چپ و راست سے گرا دیا جائے تاکہ پورے طور سے محاصرہ کرنا ممکن ہو۔ اصحاب سید الشہداءؑ نے جو یہ دیکھا تو متفرق طور پر اپنے اپنے خیموں

کے اندر داخل ہو کر منتظر بیٹھ گئے۔ جس خیمہ میں کوئی داخل ہوتا کہ طنابیں کاٹ کر اُس خیمہ کو گرائے فوراً وہ قتل کیا جاتا اور اُس کی لاش باہر پھینک دی جاتی۔ عمر سعد کو اس تدبیر میں بھی شکست اُٹھانا پڑی تو اُس نے کہا کہ اچھا ان سب خیموں میں آگ لگا دو۔ کسی خیمہ کے اندر جا کر گرانے کی کوشش نہ کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کا خیمہ اور حرم سرائے عصمت اس مسلسل خیموں کی قطار سے علیحدہ تھا اور جداگانہ قائم تھا۔ فوج کے سپاہی جب ان خیموں میں آگ دینے لگے تو امامؑ نے فرمایا آگ لگا دینے دو اس لیے کہ اگر انھوں نے آگ لگا دی اور شعلے بھڑکنے لگے تو پھر بھی اس طرف سے تم پر حملہ نہ کر سکیں گے اور جو ان کا مقصد ہے وہ پورا نہ ہوگا۔

اصحاب حسینؑ نے مدافعت چھوڑ دی اور عمر سعد کی فوج آگ لگانے میں کامیاب ہوئی مگر نتیجہ نے بتا دیا کہ عمر سعد ایسے ایک بڑی فوج کے افسر نے سیاست جنگ میں غلطی کی اور حسینؑ ایسے چھوٹی فوج کے سپہ سالار کی رائے حرف بحرف درست ہوئی۔ یعنی آگ لگانے سے دشمن کے لیے خود اس طرف کا راستہ بند ہو گیا اور مقابلہ کا موقع صرف سامنے ہی کی جانب سے باقی رہ گیا۔

اپنی تدبیر کے شکست کھانے کا بیجا غصہ تھا جس نے کمینہ طبیعت شمر کو برافروختہ کر دیا اور اُس نے مخصوص امام حسینؑ کے

خیمہ پر حملہ کرکے اپنا نیزہ خیمہ کے اوپر مارا اور کہا کہ لاؤ آگ لاؤ تاکہ میں اس گھر کو اس کے رہنے والوں سمیت جلادوں۔

اس آواز کا اثر تھا کہ خیمہ میں ایک شور نالہ و فریاد کا بلند ہوگیا جس سے غیرت دار پیکر شرافت امام حسینؑ بن علیؑ کو تاب نہ رہی اور پکار کر فرمایا:۔

"اے شمر تو آگ اس لیے منگا رہا ہے کہ میرے گھر کو میرے اہل و عیال سمیت جلا دے! خدا تجھے آگ سے جلنا نصیب کرے"

فوج کے دوسرے سپاہیوں نے شمر کو منع کیا اور شبث بن ربعی نے مخصوص طور سے شمر کے پاس آکر کہا:۔

ما رأیت مقالا اسوء من قولك ولا موقفا اقبح من موقفك امرعبا للنساء صرت۔

"میں نے آج تک ایسی شرمناک بات نہیں سنی جیسی تو کر رہا ہے اور نہ اس سے بدتر اقدام دیکھا جس کا تو نے ارادہ کیا ہے۔ تو عورتوں کو خوف زدہ کرتا ہے۔"

ان سب لوگوں کے کہنے سے شمر بھی کچھ شرمندہ سا ہوا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا، اتنی دیر میں زہیر بن قین نے اپنے دس بہادر ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور اتنا سخت حملہ کیا شمر اور اس کے ساتھ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دور ہٹا دیا ابو عزہ ضبابی کو جو شمر کا خاص آدمی اور اس کے قبیلہ سے تھا قتل کر دیا۔

دشمن کی فوج نے جو اپنے ایک ممتاز سپاہی کو اس حملہ میں قتل ہوتے دیکھا پورے جوش و خروش سے ان دسوں آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور سخت خوں ریز لڑائی ہوئی، مگر ان بہادروں نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں دشمن کو شکست ہوئی مگر اس کے بعد اصحاب حسینؑ میں سے بھی اکّا دکّا افراد قتل ہوتے رہے۔ کثرت اور قلت کا مقابلہ کیا؟ طبری کے بیان کے موافق صورت یہ تھی کہ:۔

اذا قتل منھم الرّجل والرّجلان تبین فیھم وادلٰئک کثیر لا یتبیّن فیھم ما یقتل منھم۔

"ان میں سے ایک یا دو بھی قتل ہوتے تو اس سے نمایاں کمی پیدا ہوتی تھی اور وہ بہت کثیر تعداد میں تھے اس لیے جتنے بھی قتل ہوتے تھے کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔"

وہ اشخاص جو پہلے حملہ کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے واقعہ سے پہلے شہید ہوئے اُن میں سے بعض کے اسماء تاریخ میں حسب ذیل ملتے ہیں۔

(۱) بکر بن حی بن تیم اللہ بن ثعلبۃ التیمی۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھے کہ جو عمر سعد کی فوج میں امام حسینؑ سے جنگ کو آئے تھے مگر جب جنگ چھڑی اور موت کا بازار گرم ہوا تو توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور یہ فوج حسینیؑ میں شامل ہو کر نصرت امام میں شہید ہوئے

ابصار العین میں ہے کہ قتل بین یدی الحسین بعد الحملۃ الاولیٰ "یہ امام حسینؑ کی نصرت میں پہلے حملہ کے بعد قتل ہوئے۔"

(۲) کنانہ بن عتیق تغلبی، ان کے متعلق لکھا ہے قتل مبارزۃ فی ما بین الحملۃ الاولیٰ والظہر "یہ مبارز طلبی کی جنگ میں "حملۂ اولیٰ" اور ظہر کے درمیان شہید ہوئے۔

(۳) عمرو بن جنادہ بن کعب خزرجی۔ کمسن نابالغ یتیم جس کے باپ جنادہ بن کعب "حملۂ اولیٰ" میں شہید ہوئے۔ بحریہ بنت مسعود اس بچہ کی بیوہ ماں نے بچہ کو ہدایت کی کہ وہ بھی باہر نکلے اور حسینؑ کی نصرت میں جنگ کرے۔ بچہ خدمت امامؑ میں آیا اور طالب اجازت ہوا۔ حضرت نے اجازت دینے سے انکار کیا، بچہ نے پھر رخصت طلب کی۔ حضرت نے اصحاب کی طرف رُخ کرکے فرمایا۔ "ابھی تو اس کا باپ معرکۂ جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ اب بھلا اس کی ماں کے دل پر کیا گذرے گی جو یہ بھی جاکر قتل ہو۔" بچہ نے کہا آقا میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اور اُن ہی نے مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔ امامؑ مجبور ہوئے اور اجازت دی۔ بچہ میدان میں آیا اور لڑکر قتل ہوا۔ سخت دل اور بے رحم فوج نے بچہ کا سر کاٹ کر فوج حسینی کی طرف پھینک دیا، پر طاقت والی ماں نے بچہ کا سر اٹھا لیا اور کہا "شاباش بیٹا شاباش تو نے میرا دل خوش کر دیا اور میری

آنکھوں میں ٹھنڈک ڈال دی۔" پھر اُس سر کو اُٹھا کر فوجِ دشمن کی جانب پھینک دیا اور خود بھی عمود خیمہ لے کر دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ امامؑ نے جو دیکھا اسے گوارا نہ کیا اور اُس عورت کو خیمہ کی جانب واپس فرما دیا۔"

واقعہ کربلا کی ایسی مثالیں وہ ہیں جو دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہیں اور ہمیشہ بے نظیر صورت پر قائم رہیں گی۔

(۴) یزید بن حسین المشرقی، ان کا تذکرہ شیخ عبد اللہ مامقانی طاب ثراہ کی کتاب تنقیح المقال میں ہے اور لکھا ہے:۔

کان ممن جاھد من اصحابہؑ وممن قتل قبل الظھر

"یہ اُن اصحاب میں سے تھے جنھوں نے حضرت کی نصرت میں جنگ کی اور ظہر کے قبل شہید ہوئے۔"

بیسواں باب

ظہر کا ہنگام

اور

نمازِ ظہر کا ہنگامہ

میدان میں ایک طرف گرمی سے آگ برس رہی تھی دوسری طرف

جنگ کی وجہ سے خون کی بارش تھی۔ اس عالم میں ظہر کا وقت آیا تو ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا۔

" مولاؑ میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اب آپ کے بالکل قریب آگئے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ آپ پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی جب تک میں انشاء اللہ آپ کے سامنے قتل نہ ہو جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو جس کا وقت آ ہی گیا ہے آپ کے ساتھ پڑھ لوں اُس کے بعد خدا کی بارگاہ میں جاؤں"۔

امامؑ نے سر اُٹھایا اور فرمایا ذکرت الصّلوٰۃ جعلک اللّٰہ من المصلّین الذاکرین نعم ھذا اوّل وقتھا" تم نے نماز کو یاد کیا خدا تم کو نماز گذاروں اور یاد رکھنے والوں میں محسوب کرے۔ ہاں یہ نماز کا اوّل وقت ہے"۔

پھر حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو اتنی دیر جنگ سے ہاتھ روک لیں کہ ہم لوگ نماز پڑھیں"۔

اللہ! رسولؐ کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوئی، نماز کی مہلت مانگے اور نہ ملے بلکہ مہلت کے سوال پر حصین بن تمیم صف سے باہر نکلے اور یہ کہے کہ " تمہاری نماز قبول نہیں ہے"۔

جس پر حبیب بن مظاہرؓ بے چین ہو جائیں اور یہ کہیں کہ " فرزند رسولؐ کی نماز قبول نہ ہو اور تیری نماز قبول ہو"۔

حصین بن تمیم کو یہ سُن کر غصّہ آتا ہے اور وہ حملہ کر دیتا ہے۔

حبیبؓ اُس کے مقابلہ کو جاتے ہیں۔ حبیب نے جاتے ہی اُس کے گھوڑے کے مُنھ پر تلوار ماری جس سے وہ بھڑکا اور حصین زمین پر آرہا۔ اُس کے ساتھیوں نے فوراً آ آکر اُس کی حفاظت کی اور بچا کر لے گئے۔ حبیب نے یہ شعر پڑھنا شروع کیے۔

اقسم لو کنا لکم اعدادا او شطرکم ولیتم اکتادا

یا شرّ قوم حسبا و اُدا

"قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر ہم تعداد میں تمھارے برابر ہوتے یا تمھارے آدھے بھی ہوتے تو تم ضرور شکست کھا کے واپس جاتے۔ اے بدترین قوم حسب و نسب کے اعتبار سے"۔ پھر جوشِ جہاد زیادہ بڑھا اور یہ رجز پڑھنے لگے:-

انا حبیب و ابی مظاهر فارس هیجاء و حرب تسعر

انتم اعدّ عدّۃ و اکثر و نحن اوفی منکم و اصبر

و نحن اعلیٰ حجۃ و اظهر حقاً و اتقیٰ منکم و اعذر

"میں حبیب ہوں اور میرے باپ مظاہر تھے۔ میں میدانِ جنگ اور اس موقع کا جب لڑائی کے شعلے بھڑک رہے ہوں شہسوار ہوں۔ تمہارے پاس جنگ کا سامان ہم سے زیادہ ہے اور تعداد میں بھی ہم سے زیادہ ہو مگر ہم وفاداری و استقلال اور صبر و برداشت رکھتے ہیں اور حقانیت کا ثبوت اور سچائی کی طاقت اور خدا کا خوف اور اپنے حق بجانب ہونے کی سند تم سے زیادہ رکھتے ہیں"۔

اس کے بعد شدت کے ساتھ جنگ کی۔ ایک شخص نے بنی تمیم میں سے جس کا نام بدیل بن ضریم تھا تلوار سے اُن پر حملہ کیا۔ اُنھوں نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ دوسری طرف سے دوسرے شخص نے نیزہ لگایا جس سے یہ گر گئے مگر پھر سنبھل کر چاہتے تھے اٹھیں کہ حصین بن تمیم نے تلوار سر پر لگائی جس سے حبیب خاک پر گر پڑے اور پہلے سپاہی نے اُتر کر سر اُن کا قلم کر لیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حبیب بن مظاہرؓ کے قتل ہونے سے امام حسینؑ کے چہرہ پر شکستگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور انتہائی صدمہ کا اظہار ہوا۔

اس وقت حُر بن یزید ریاحی نے جو اپنے گھوڑے کے پے ہونے کے بعد پیادہ ہو چکے تھے اور اس کے پہلے کئی مرتبہ لڑ بھی چکے تھے زہیر بن قین کے ساتھ مل کر دشمن پر حملہ کیا۔ حُر رجز پڑھ رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے:

آلیت لا اقتل حتی اقتلا	ولن اصاب الیوم الا مقبلا
اضربھم بالسیف ضربا مفصلا	لا ناکلا عنھم ولا مھللا

"میں نے قسم کھائی ہے کہ قتل نہ ہوں گا جب تک کہ دشمنوں کو قتل نہ کر لوں اور مارا نہ جاؤں مگر پیش قدمی کرنے ہی کی حالت میں، میں آج تلواریں لگاؤں گا فیصلہ کن تلواریں نہ میرے قدم پیچھے ہٹیں گے اور

نہ کمزوری کا اظہار ہوگا۔"

کبھی یہ شعر پڑھتے تھے:۔

اضرب فی اعراضھم بالسیف عن خیر من حل منی والخیف

"میں شمشیر زنی کروں گا، اُس بہترین انسان کی جانب سے جس نے سرزمین حرم میں کبھی قیام کیا۔"

حُر اور زہیر بن قین دونوں نے مل کر جنگ کرنا شروع کی۔ حالت یہ تھی کہ ایک حملہ کرتا تھا اور جب وہ دشمنوں میں گھر جاتا تو دوسرا حملہ کر کے اُسے دشمنوں کے حلقہ سے نجات دیتا تھا۔

تھوڑی دیر یہی صورت قائم رہی لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے حُر بن یزید کا سختی سے محاصرہ کیا اور زہیر بن قین کی کوشش ان کی مدافعت میں ناکام ہوئی۔ حُر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

امامؑ نے اپنے اس ناصر کی یہ قدر کی کہ جب اصحاب اُٹھا کر میدان سے خیمہ گاہ کی طرف لائے اور حضرت کے سامنے رکھا تو حضرت خاک وخون حُر کے چہرہ سے صاف کرنے لگے اور فرمایا:۔

انت الحرکما سمّتک املک وانت الحرّ فی الدّنیا وانت الحرّ فی الاٰخرۃ۔	تم بے شک حُر ہو۔ تمہارے والدین نے تمہارا نام حُر بہت ٹھیک رکھا۔ تم دنیا میں بھی حُر اور آخرت میں بھی حُر۔

یعنی انسان کی حرّیت وشرافت کا جوہر اُس کے افعال ہی ہیں

نمایاں ہوتا ہے۔ قید و بند دنیا میں گرفتار اور ہوا و ہوس میں اسیر ہو کر حق و ناحق کے امتیاز کو ہٹا دینے والا انسان ہرگز حریت ضمیر اور شرافت نفس کے جوہر کا مالک نہیں ہے، یقیناً حُر نے تمام دنیاوی توقعات کو چھوڑ کر حق کے راستے پر قدم رکھا تو وہ حُر ثابت ہوئے اور حریت کے اصلی جوہر کو اپنے عمل سے نمایاں کر دیا۔

جنگ ملتوی نہیں ہوئی تھی اور نماز کی مہلت نہیں مل سکی ایسے موقع کے لیے شرع نے مخصوص حکم نماز خوف کا دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ فوج کے دو حصے ہو جائیں ایک حصہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کرے اور دوسرا حصہ نماز میں شریک ہو۔ وہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز تخفیف کے ساتھ فرادیٰ پڑھ کر تمام کرے اور جب یہ نماز ختم کر کے جائے اور دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ پہلا حصہ فوج کا میدان جنگ سے آکر نماز میں شریک ہو۔ مگر یہ تو اس وقت ہے جب فوج کی اتنی تعداد بھی ہو کہ اس کے دو حصے ہو سکیں اور اس کا نصف حصہ دشمن کے ساتھ مقاومت کر سکے۔ مگر فوج حسینی اس کی تو مجموعی تعداد ہی اب بہت کم تھی اس میں یہ صورت کہاں ممکن معلوم ہو سکتی تھی لیکن حسینؑ کو تو اس دن تمام اسلامی تعلیمات کو عملی صورت میں پیش کرنا تھا۔ انھوں نے اپنی

اس مختصر فوج ہی میں اس طرح تقسیم کی۔

مشہور یہ ہے کہ آپ نے صرف زہیر بن قینؓ اور سعید بن عبد اللہ حنفیؓ کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ مگر علامہ مجلسیؒ نے بحار میں جو روایت درج کی ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

فقال الحسینؑ لزھیر بن القین وسعید بن عبد اللہ تقدما امامی حتیٰ اصلی الظھر فتقدما امامہ فی نحو من نصف اصحابہ حتیٰ صلّی بھم صلوٰۃ الخوف

امامؑ نے زہیر بن قین اور سعید بن عبد اللہ حنفی سے فرمایا کہ تم دونوں میرے سامنے آگے بڑھو یہاں تک کہ میں نماز ظہر پڑھوں۔ یہ دونوں آدمی اصحاب کی تقریباً نصف جماعت کے ساتھ آگے بڑھے اور حضرتؑ نے نماز خوف ادا کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نماز خوف کی جو صورت ہے اسی طرح نماز پڑھی گئی تھی۔ مگر پھر بھی اصحاب حسینؑ کی جرأت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کمی میں کمی پیدا ہوئی یعنی وہ تعداد ہی کتنی تھی۔ اُن میں بھی نصف نماز میں مصروف ہوے اور نصف تمام فوج کے ریلے کو روکے رہے۔

بہرحال یہ نماز تھی اور یادگار نماز۔

سعید بن عبد اللہ حنفیؓ نے عجیب استقلال اور وفاداری

کا مظاہرہ کیا۔ وہ خاص امامؑ کے سامنے کھڑے تھے اور جو تیر امامؑ کی طرف آنے لگتا تھا وہ اس کو خود اپنے اوپر روکتے تھے یہاں تک کہ آخر زمین پر گرے اور روح نے جسم سے پرواز کی۔ معلوم ہوا کہ تیرہ[13] تیر اُن کے جسم میں پیوست تھے۔ زہیر بن قین نے بڑی پامردی سے جنگ کی۔ وہ کہہ رہے تھے؛

انا زھیر و انا ابن القین　　　　اذودھم بالسیف عن حسین

"میں زہیر ہوں اور قین کا فرزند ہوں۔ میں اپنی تلوار سے ان کو حسینؑ کی جانب سے دور کروں گا۔"

وہ پہلے اس سے حُر کے ساتھ بھی بہت لڑ چکے تھے اور اب پھر خوب شمشیر زنی کی آخر کو کثیر بن عبداللہ شعبی اور مہاجر بن اوس دو شخصوں نے اُن پر حملہ کیا جن کے ہاتھ سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

اکیسواں باب[21]

اصحابؑ کا خاتمہ

نماز ظہر کے بعد تمام اصحابؑ میں شہادت کا جذبہ زیادہ تیز

ہو گیا تھا۔ شمع امامت کے پروانے جاں بازی میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔

نافع بن ہلال جملیؒ

تیر اندازی میں بڑے مشاق اور یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے اپنے تیروں کے سوفار پر اپنے نام لکھ دیئے تھے ان کا ذکر اس کے پہلے بھی ہو چکا ہے۔

اُنھوں نے تیر لگانا شروع کیے جو سب زہر میں بجھے ہوئے تھے، زبان پر یہ جملہ تھا کہ انا الجملی انا علی دین علیؑ "میں قبیلۂ جمل کا آدمی علیؑ کے دین پر ہوں!"

ان تیروں نے بہت سے آدمیوں کو زخمی کیا اور بارہ آدمی تو جان سے مارے گئے آخر دشمن نے ان کو گھیر کر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ دونوں بازو اُن کے شکستہ ہو گئے اس وقت وہ گرفتار کر لیے گئے، شمر کچھ سپاہیوں کی مدد سے اُن کو پکڑ کر عمر سعد کے پاس لے گیا۔

عمر سعد نے کہا "نافع یہ تم نے اپنے نفس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" نافع کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس حالت میں جواب دیا۔ "میرے ضمیر سے تو خدا واقف ہے کہ میری نیّت کیا تھی۔ مگر خدا کی قسم مجھے خوشی ہے کہ میں نے بارہ آدمی تم میں سے جان سے مارے ہیں اور زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی

نہیں کی اور اگر میرے بازو نہ ٹوٹ جاتے تو تم مجھے اس طرح گرفتار ہرگز نہ کر سکتے۔"

شمر نے کہا اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ عمر سعد نے کہا تم ہی گرفتار کر کے لائے ہو۔ تمھیں اختیار ہے۔ شمر نے تلوار کھینچی، نافع نے کہا "اگر تم لوگ مسلمان ہوتے تو کبھی ہم لوگوں کے خون میں ہاتھ نہ بھرتے، شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہم لوگوں کی موت اپنے مخلوق میں سے بد ترین لوگوں کے ہاتھوں سے قرار دی۔"

شمر نے تلوار لگائی نافعؓ شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہوئے۔

پست حوصلہ اور کمینہ فطرت شمر اس زخمی اور گرفتار شدہ مجاہد کو قتل کر کے فتح مندی کا احساس کرنے لگا اور رجز کے اشعار زبان پر جاری کر کے امام حسینؑ کے اصحاب پر حملہ آور ہوا۔

اصحاب امامؑ کی اب یہ حالت تھی کہ ہر ایک چاہتا تھا ہم پہلے اپنی جان نثار کر دیں۔

عبداللہؓ و عبدالرحمٰنؓ

فرزندان عزرہ غفاری دونوں بھائی امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے:

"آپ کو ہمارا سلام قبول ہو۔ اب دشمن بہت قریب آگئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے سامنے قتل ہوں اور آپ کی

حفاظت میں اپنی جان نثار کریں"! حضرت نے فرمایا "آؤ۔ میرے قریب کھڑے ہو کر جنگ کرو"۔ دونوں نے حضرت کے نزدیک ہی کھڑے ہو کر لڑنا شروع کیا اور دونوں شہید ہوے۔

سیف بن حارث بن سُریع و مالک بن عبد بن سُریع

دونوں چچازاد بھائی اور ایک ماں کی اولاد تھے، دونوں جوان امامؑ کی خدمت میں آئے اور بس نزدیک کھڑے ہو کر رونے لگے۔ اصحابؑ کے دل کی بے چینیاں اُن کے طرزِ عمل سے نمایاں اور امامؑ کا استقلال اُن کی باتوں سے ہویدا ہے۔ اُن کے مُنھ سے رنج و غم کی وجہ سے بات نہیں نکلتی۔ امامؑ کے پاس کھڑے ہیں اور بس آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں "کیوں میرے بھائی کے فرزندو! روتے کیوں ہو؟ تھوڑی دیر میں ابھی دیکھو خوشی ہی خوشی تمھیں نصیب ہو گی"۔ بہادر جاں نثار عرض کرتے ہیں:-

"ہماری جان آپ پر قربان۔ ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بے کسی پر رونا آتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور ہم سے اب آپ کی حفاظت ہونے نہیں معلوم ہوتی!

حضرتؑ نے فرمایا "خدا تم دونوں کو اے میرے بھتیجو

جزائے خیر دے۔ اس صدمہ کی وجہ سے اور اس ہمدردی کے لیے جو تمھیں میرے ساتھ ہے، خدا تم کو بہترین جزا عطا کرے" ان دونوں جوانوں نے اپنی جان آقا پر فدا کی۔

بریر بن خضیر ہمدانیؓ

پورے طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی شہادت ظہر کے قبل ہے یا ظہر کے بعد۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اوائل جنگ میں شہید ہوئے ہیں۔ مجلسیؒ نے بحار میں ان کی شہادت کو حُر بن یزید ریاحی کے بعد لکھا ہے مگر یہ شاید اُسی غلطی پر مبنی ہو کر خود حُر کی شہادت کو اوائل جہاد میں بتلایا گیا ہے۔

بہر حال صورت یہ ہے کہ یزید بن معقل نے جو فوج عمر بن سعد میں تھا صف سے باہر نکل کر بریر کو آواز دی اور کہا کیوں بریر دیکھتے ہو خدا نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ بریرؓ نے کہا میرے ساتھ تو خدا نے اچھا ہی سلوک کیا۔ ہاں تیرے ساتھ سلوک بُرا کیا۔ یزید نے کہا یہ تم جھوٹ کہتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تمھیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی اچھا کچھ یاد ہے ایک دن ہم اور تم بنی لوذان کے محلّہ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ تم اُس موقع پر کہتے تھے کہ عثمان گنہگار تھے اور معاویہ بن ابی سفیان ایک گمراہ اور گمراہ کن انسان ہے اور سچّے امام اور حقیقی رہنما صرف علی بن ابی طالب

بریرؓ نے کہا بے شک میری رائے یہی ہے اور اسی قول پر اب بھی قائم ہوں۔ یزید نے کہا میں تو تمھیں گمراہ سمجھتا ہوں۔ بریرؓ نے کہا اچھا مباہلہ کرنا چاہتے ہو؟ آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور جو حق پر ہو اسکے ہاتھ سے باطل عقیدہ والے کو قتل کرا دے پھر باہر نکل کر ہم دونوں آدمی جنگ کریں یزید نے اس کو منظور کر لیا۔ دونوں میدان میں آگئے۔

یقیناً دونوں فوجوں کی آنکھیں لڑی ہوی ہوں گی۔

حق اور باطل دونوں کا کھلا ہوا مقابلہ اور فیصلہ کن امتحان، دونوں نے دعا کی اور اس کے بعد جنگ شروع کر دی۔ صرف دو ضربتوں کے ردو بدل کی نوبت آئی۔ پہلے یزید بن معقل نے وار لگایا جو بریر پر چھچلتا ہوا پڑا اور کوئی زخم تک بریرؓ کے نہیں آیا۔ اس کے بعد بریرؒ نے تلوار لگائی تو وہ خود کو کاٹتی ہوی کاسۂ سر میں در آئی اور فوراً وہ انسان زمین پر گرا، معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ پھٹ پڑا۔

مباہلہ کا نتیجہ فیصلہ کن صورت میں نمایاں ہو گیا۔

"قاتلان حسینؑ کا مذہب" رسالہ میں میں نے اس واقعہ سے پورا پورا نتیجہ حاصل کیا ہے۔ بریرؓ نے اس جنگ میں فتح نہیں حاصل کی بلکہ دلیل حقانیت تھی جو مکمل طور سے فتحیاب ہوی اور آفتاب کی طرح نمایاں ہوی۔

کاش دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلتیں مگر نہیں۔ ادھر بریر اپنی

تلوار دشمن کے کاسۂ سر سے باہر نکال رہے تھے اُدھر رضی بن منقذ عبدی نے بریر پر حملہ کر دیا۔ بریرؓ اُس سے دست و گریبان ہو گئے۔ آخر دشمن مغلوب ہوا۔ اور بریرؓ اُس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ کمزور دل والے مغلوب انسان نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے پکارا۔ کعب بن جابر بن عمرو ازدی آگے بڑھا کہ حملہ کرے، فوج والے دوسرے سپاہیوں نے منع بھی کیا کہ یہ بریرؓ حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں قرآن حفظ کرایا کرتے تھے مگر اُس نے نہ مانا اور پشت کی جانب سے بریرؓ پر حملہ کرکے نیزہ پشت کے پار کر دیا۔ پھر تلوار لگا کر بریرؓ کا کام تمام کیا۔

حنظلہ بن اسعد شبامیؓ

امامؑ کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے اور پکار پکار کر کہنے لگے:-

یا قوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب مثل داب قوم نوح وعاد وثمود والذین من بعدھم وما اللہ یرید ظلما للعباد ویا قوم انی اخاف علیکم یوم التناد

اے لوگو میں ڈرتا ہوں تم لوگوں کے لیے اُسی طرح کا عذاب نہ آئے جیسا دوسری قوموں پر آیا جیسے نوح اور عاد اور ثمود کی قوم کے لیے ہوا اور خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں چاہتا مجھے اندیشہ ہے تمہارے لیے روز قیامت کا جب کہ دنیا سے مُنھ

یوم تولون مدبرین مالکم من اللّٰہ من عاصم ومن یضلل اللّٰہ فما لہ من ھاد یا قوم لا تقتلوا حسینا فیسحتکم اللّٰہ بعذاب وقد خاب من افتریٰ۔

پھرائے ہو گے اور تمہارا کوئی حفاظت کرنے والا نہ ہوگا اور جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دے اُس کا کوئی رہنما نہیں۔ ارے حسینؑ کو قتل نہ کرو، نہیں تو خدا تم پر عذاب نازل کرے گا۔ سچ کہتا ہوں تم سے، جھوٹا ہمیشہ ناکام اور مایوس ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے ایک جذبہ ہے اظہار حق کا جو بے چین کیے ہوئے ہے۔ امامؑ نے فرمایا: "اے حنظلہ عذاب کے مستحق تو یہ اسی وقت ہو چکے جب تمہاری دعوت حق کو مسترد کیا اور تمہارے مقابلہ کے لیے فوج کشی کر کے آ رہے چہ جائیکہ اب۔ اب تو انھوں نے تمہارے نیکو کار اور پارسا بھائیوں کو قتل بھی کیا۔

حنظلہ نے کہا "مولاؑ۔ آپ کی معرفت مجھ سے زیادہ ہے۔ مجھ کو یہ درجہ کہاں حاصل؟ اچھا تو آپ اجازت دیتے ہیں؟ ہم بھی جا کر اپنے بھائیوں سے ملحق نہ ہوں"۔ حضرت نے فرمایا اچھا جاؤ اُس عالم کی طرف جو اس دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور اُس ملک کی جانب جو فنا ہونے والا نہیں"۔ حنظلہ نے کہا "آمین آمین" یہ کہہ کر آگے بڑھے۔ جنگ کی اور شہید ہو گئے۔

عابس بن ابی شبیب شاکریؓ

کوفہ کے ایک نام آور بزرگ مرتبہ شخص تھے اپنے غلام شوذب کے ساتھ امامؑ کی نصرت کو آئے تھے یہ غلام ان کو بہت عزیز تھا اور غلام بھی بہت وفا شعار تھا۔

وہ متوجہ ہوئے اپنے غلام کی طرف اور کہا "کیوں کیا ارادہ ہے؟" غلام نے کہا" ارادہ کیا ہے؟ یہی کہ آپ کے ساتھ فرزند رسولؐ کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہوں۔" عابس نے کہا شاباش "مجھے تجھ سے یہی اُمید تھی۔ اچھا تو پھر آگے بڑھ اور امامؑ پر جاں نثار کرتا کہ امام تیری مصیبت بھی اسی طرح دیکھ لیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی، اور میں بھی تیرے غم کو اٹھا کر ثواب کا مستحق بن جاؤں۔ یقیناً اُس وقت اگر کوئی ایسا شخص موجود ہوتا جو تجھ سے زیادہ مجھے عزیز ہو تو میں اُسے بھی اپنے سامنے بھیجتا تاکہ اُس کی مصیبت کو برداشت کرنے کا ثواب حاصل کروں کیوں کہ آج تو ایسا دن ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اُتنا اجر و ثواب حاصل کرے، اس لیے کہ آج عمل کا دفتر ختم ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد بس حساب ہی حساب ہے۔"

کیا کہنا اس جذبۂ اطاعت اور اخلاص معرفت کا۔ کیا کہنا اس استقلال و اطمینان کا کہ معلوم ہوتا ہے مصیبتیں خود اختیاری طور پر

اُٹھائی جا رہی ہیں اور ان میں ترتیب و نظم قائم کیا گیا ہے۔ کو
ناگہانی اور اچانک صورت نہیں ہے۔

یہی وہ پہلو تھا جس کے لحاظ سے جناب عباسؑ نے اپنے
بھائیوں کو اپنے سامنے بھیجا۔ اس کا تذکرہ بعد کو آئے گا۔

باوفا غلام آگے بڑھا۔ امام حسینؑ کو سلام کیا اور میدان
میں جاکر لڑا اور شہید ہوا۔ اب عابس بن شبیبؓ خود امامؑ کی خدمت
میں حاضر ہوئے اور کہا:۔

"بخدا روئے زمین پر نزدیک یا دور کوئی بھی ایسا نہیں ہے
جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز اور آپ سے زیادہ محبوب ہو۔
اگر مجھے قدرت ہوتی تو میں اپنی جان سے زیادہ کوئی عزیز
شے آپ کی خدمت میں پیش کروں اور آپ پر نثار کردوں تو
ایسا ہی کرتا مگر اب تو بس میری جان ہی باقی ہے۔ تو پھر اجازت
دیجئے۔ میں خدا کو گواہ کیے دیتا ہوں کہ آپ اور آپ کے باپ
کے دین ہی پر قائم ہوں۔"

معلوم ہے کہ دنیا کے سپہ سالار خود سپاہیوں کو میدان جنگ
میں بھیجتے اور کٹواتے ہیں مگر کربلا کا معرکہ اس سے مختلف تھا۔
یہاں ہر انسان اپنے دل کی تحریک اور ضمیر کی ہدایت سے
جاں نثار کر رہا تھا اور اس کو بھی ادائے فرض میں کم محسوس
کرتا تھا۔

عابس رضؓ سلام رخصت کرنے کے بعد ہاتھ میں ننگی تلوار لیے میدان کی طرف چلے، پیشانی پر ایک زخم تھا جو شاید پہلے حملوں میں آگیا تھا۔ فوج کوفہ کا ایک شخص ربیع ابن تمیم جو کربلا سے واپس ہوا تھا بیان کرتا ہے کہ میں نے عابس کو آتے دیکھا تو پہچان لیا۔ میں انھیں اس کے پہلے لڑائیوں میں دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ یکتائے روزگار شجاع اور جنگ آزما ہیں۔ میں نے کہا:۔

ایھا النّاس ھذا اسد الاسود ھذا ابن شبیب لایخرجنّ الیہ احدٌ منکم	"اے اہل فوج یہ شیروں کا شیر ابن شبیبؓ ہے اس کے مقابلہ کو تم میں سے کوئی

باہر نہ نکلے۔"

ان الفاظ سے فوج پر اتنی ہیبت چھائی کہ عابسؓ نے ہر چند آوازیں دیں الا رجل لرجل "کوئی مرد میدان نہیں جو ایک مرد میدان کے مقابلہ کو آئے"۔ مگر فوج میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکلا۔

عمر سعد نے کہا اس بہادر کو پتھر مارنا شروع کردو۔ واہ۔ کیا خوب اصول جنگ ہے اور کیا شجاعت و بہادری، چاروں طرف سے پتھر برسنے لگے۔ عابس نے جو یہ دیکھا اپنی زرہ اور خود بکتر اُتار کر

اُن کے سامنے سے بھاگتے نظر آتے تھے۔ آخر فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

عمرو بن قرضہ انصاری رضؓ نے پہلے تو حملہ کیا اور تلوار چلائی پھر امامؑ کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے جو تیر آتا اُسے اپنے اوپر روکتے اور جو وار ہوتا خود سپر بن جاتے تھے آخر زخموں سے چور ہو گئے۔ امامؑ کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں فرزند رسولؐ میں نے فرض کو ادا کیا؟ حضرت نے فرمایا "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے۔ رسول خداؐ کو میرا اسلام پہونچا دینا اور کہنا کہ میں بھی عنقریب آتا ہوں۔

یہ سُن کر بہادر جاں باز جوش میں بھر گیا۔ دشمنوں کی فوج میں گھس گیا اور قتل ہوا۔

جون رضؓ ابوذر غفاری رضؓ کے حبشی غلام تھے۔ امامؑ نے ان سے فرمایا "کہ تمھیں میں خصوصیت سے اجازت دیتا ہوں کہ تم چلے جاؤ، اس لیے کہ تم ہمارے ساتھ راحت کے لیے تھے۔ اب ہماری وجہ سے کوئی ضرورت نہیں کہ تم مصیبت میں مبتلا ہو۔"

با وفا غلام نے کہا:۔

"بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ راحت کے زمانہ میں تو میں آپ کے یہاں کے پیالے چاٹوں اور سختی میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں، خدا کی قسم میرے جسم سے بد بو آتی ہے اور میرا حسب نسب پست ہے۔

اور میرا رنگ سیاہ ہے۔ آپ اپنے صدقہ میں مجھے بھی جنّت کا مستحق
بنوا دیجئے تو میری بو خوشبو ہو جائے۔ میرا حسب شریف ہو جائے
میرا رنگ سفید ہو جائے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہوں گا جب تک
یہ سیاہ خون آپ کے پاکیزہ خون میں مل نہ جائے۔"
یہ کہہ کر بہادر غلام میدان جنگ میں آیا اور یہ رجز پڑھنا شروع کی۔

کیف تری الکفار ضرب الاسود	بالسیف ضربا عن نبی محمّد
اذبّ عنهم باللسان والید	ارجو به الجنّة یوم المورد

"ذرا کافر دیکھیں تو ایک سیاہ غلام کی شمشیر زنی کو اولاد رسولؐ
کی حمایت میں۔ میں زبان سے اور ہاتھ سے برابر ان کی نصرت
کروں گا اور اس سے روز قیامت بہشت کا امیدوار ہوں۔"
جنگ کی اور شہادت حاصل کی۔ امامؑ کے دل میں غلام کے
الفاظ اثر کر گئے تھے۔ آپ لاش پر تشریف لائے اور ہاتھ اٹھا کر
یہ دعا کی کہ اللّٰھمّ بیض وجھہ وطیّب ریحہ واحشرہ
مع الابرار وعرّف بینہ وبین محمّد وال محمّد۔
"پروردگار اس کے چہرہ کو روشن کر دے اور اس کی بد بو کو
خوشبو سے مبدّل کر دے اور اسے اچھے آدمیوں کے ساتھ
محشور فرما اور اُس میں اور محمد و آل محمدؐ کے درمیان شناسائی
قرار دے۔"
امام زین العابدینؑ کا بیان ہے کہ جب بنی اسد شہداءؑ کو دفن

کرنے قتل گاہ میں آئے تو جونؓ کے جسم سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔"

غلام ترکیؓ

یہ امام حسینؑ کا غلام تھا اور واضح نام تھا حافظ قرآن تھا میدان جنگ میں آکر یہ رجز پڑھی:

البحر من طعنی وضربی یصطلی | والجو من سھمی ونبلی یمیلی
اذا حسامی فی یمینی ینجلی | ینشق قلب الحاسد المبجلی

"سمندر میں میرے نیزہ و شمشیر کی گرمی سے آگ لگ جائے اور فضا میرے تیروں کی پرواز سے مملو ہو جائے۔ جب میری تلوار میرے ہاتھ میں چمکتی ہے مغرور حاسدوں کا دل شگافتہ ہو جاتا ہے۔"

یہ غلام جب لڑ کر زخمی ہوا اور زمین پر گرا تو امامؑ سرہانے آئے اپنا رخسارہ اُس غلام کے رخسارہ پر رکھ کے گریہ فرمانے لگے۔ غلام نے آنکھ کھولی اور امامؑ کی اس عزت افزائی کا مشاہدہ کیا۔ لبوں پر مسکراہٹ آئی اور روح جسم سے مفارقت کر گئی۔

یہ سلوک جو امامؑ نے اس غلام کے ساتھ کیا ہے بہت سے عزیزوں کے ساتھ بھی نہ کیا ہوگا۔

سب سے آخری شخص

طبری کی تصریح کے موافق جو شہید ہوئے وہ سوید بن عمرو بن ابی المطاع خثعمی تھے اہل سیر کا بیان ہے کہ سویدؓ نے جنگ کی اور زخموں سے چور

بے ہوش ہو کر گرے۔ یقین کیا گیا کہ وہ ختم ہو گئے مگر ان میں سانس باقی تھی۔ جب امام حسینؑ شہید ہو گئے اور یہ آواز بلند ہوئی کہ قتل الحسینؑ۔ سوید کو غش سے افاقہ ہوا۔ ایک چھری اُن کے پاس موجود تھی۔ اُنھوں نے اُس چھری سے قریب کے بعض لوگوں پر حملہ کیا، دشمنوں نے پھر ہجوم کر کے اُنھیں قتل کر دیا۔

دوسرے اصحاب

حضرت امام عصر عجل اللہ فرجہ کی زیارت ناحیہ میں اور اُس زیارت میں جو اوّل رجب کے لیے وارد ہوئی ہے بہت سے دیگر اصحاب کا تذکرہ ہے اور اُن کو سلام مخصوص کے ساتھ ممتاز کیا گیا ہے مگر اُن کی جنگ کے خصوصی واقعات پورے طور پر محفوظ نہیں ہیں۔

مجموعی تعداد

جہاں تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے شہدائے کربلاؑ کی تعداد بحیثیت مجموعی ۷۲ سے زیادہ تھی۔ پچاس تو وہی تھے جو حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ وہ شہداؑ جو جنگ کر کے شہید ہوئے وہ بہتر ۷۲ ہی ہوں مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں جہاں تک یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں شہداء کی تعداد سَو سے زیادہ اور دو سَو ۲۰۰ سے کم ہے۔ اصحاب میں کچھ وہ تھے جو مکۂ معظمہ سے ساتھ آئے تھے اور زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھوں نے کوفہ سے حضرت کو دعوت دی تھی اور جناب مسلمؑ کی بیعت بھی کی تھی اور

پھر صورتِ حال کے تبدیل ہو جانے سے وہ کوفہ کے حالات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور آخر اُنھوں نے کربلا میں آکر اپنی جان نثار کی۔

اور اسی لیے میں کوفہ والوں کی وفاداری کو سید الشہداءؑ کے معاملہ میں ہرگز مشکوک نظر سے نہیں دیکھتا۔ کوفہ کے وہ جاں نثار اور بہادر جو درحقیقت سید الشہداءؑ کو بلوانے والے تھے اُن میں سے جو جو پہونچ سکے وہ کربلا پہونچے اور اپنی جان کی نذر پیش کی میں نے "قاتلان حسینؑ کا مذہب" میں اس پر تبصرہ کیا ہے بعض لوگ وہ بھی تھے جو کوفہ سے عمر سعد کی فوج میں شریک ہو کر آئے تھے اور جب تک گفتگوئے صلح ہوتی رہی وہ فوج عمر سعد میں رہے لیکن جب لڑائی ٹھن گئی اور صلح کی اُمید بالکل قطع ہو گئی تو وہ فوج عمر سعد سے نکل کر امامؑ کی خدمت میں آگئے مشہور طور پر اس کی مثال میں صرف حُر بن یزید ریاحی کو پیش کیا جا سکتا ہے مگر ایسے متعدد آدمی تھے۔ ان کا تذکرہ ہماری کتاب "شہدائے کربلا" میں موجود ہے۔

اصحاب حسینؑ نے جس پُرجگری، جس جواں مردی، جس ثبات و استقلال کے ساتھ جان دی ہے وہ دنیا میں یادگار ہے۔ اس کی قدر امام عصرؑ نے یہ کی کہ زیارت کے سلسلہ میں نام بنام ان پر

سلام کیا اور ان سب کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا:۔

بابی انتم وامی طبتم وطابت الارض التی فیھا دفنتم وفزتم واللہ فوزاً عظیما فیا لیتنی کنت معکم فافوذ معکم۔

"میرے ماں باپ تم پر فدا۔ پاک وپاکیزہ ہوئے تم اور پاک ہوئی وہ زمین جہاں تم دفن ہوئے۔ تم بخدا اعظیم درجہ پر فائز ہوئے۔ کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور اسی درجہ پر فائز ہوتا۔"

ہم بھی برابر یہ آرزو کرتے ہیں اور یہی کلمہ زبان پر جاری کرتے ہیں مگر کیا ہم اپنے دل میں وہی جذبہ معرفت وہ اخلاص و عقیدت وہی قوت عمل۔ وہی فرض شناسی بھی پیدا کرنے پر تیار ہیں جو اصحاب حسینی علیہ السلام میں موجود تھی؟

بائیسواں ۲۲ باب

عزیزوں کی باری

شہید اوّل

شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبر علیہ السلام

اب تک اصحاب علیہ السلام تھے جو اپنے امام علیہ السلام اور آقازادوں کی حفاظت

کر رہے تھے۔ اُنھوں نے دکھلا دیا کہ جب تک وہ زندہ رہے ان میں سے کسی کا بال بیکا نہیں ہوا مگر اب؟ اب بس حسینؑ تھے۔ حسینؑ کے فرزند تھے اور حسینؑ کے بھائی بھتیجے تھے۔ ہم نے "اُسوۂ حسینی" کے سلسلہ میں اس صورت حال کی نزاکت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ کیا حسینؑ خاص اپنی اولاد کو محفوظ رکھتے اور پہلے بھائی کی اولاد چچا کی اولاد اور دوسرے عزیزوں کو مرنے کے لیے بھیج دیتے؟ ہرگز نہیں۔ حسینؑ نے سب سے پہلے اپنے جوان فرزند علی اکبرؑ کو جو ہُوبہو رسولؐ کی تصویر تھا میدان جنگ میں جانے کی اجازت دی۔

امامؑ کے دل پر اس وقت کیا گذر رہی تھی۔ اُس کو الفاظ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اپنے ہاتھ بارگاہ خدا میں بلند کیے اور کہا:۔

اللّٰھم اشھد علی ھؤلاء القوم فقد برز الیھم غلام اشبہ الناس خلقا وخلقا ومنطقا برسولک کنا اذا اشتقنا الی نبیک نظرنا الی وجھہ۔

خداوندا گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر کہ اب جا رہا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت وسیرت اور گفتار میں تیرے رسولؐ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہے جب ہم تیرے پیغمبرؐ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔"

علی اکبرؑ میدان جنگ میں آئے اور یہ رجز پڑھنا شروع کیا:۔

انا علی بن حسین بن علی　　نحن ورب البیت اولی بالنبی

تا اللہ لا یحکم فینا ابن الدعی

"میں ہوں علی۔ حسینؑ کا بیٹا اور علیؑ کا پوتا۔ ہم بخدا سب سے زیادہ حقدار ہیں رسولؐ کے۔ ہر گز خدا کی قسم ہم میں حکومت نہیں کر سکتی زنا زادہ کی اولاد۔"

یہ رجز نہیں ہے تبلیغی تقریر ہے۔ اس میں اتنے مختصر الفاظ میں پورے طور سے اسباب و علل جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس میں اپنی ولایت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے اور حکومت وقت کے تسلیم کرنے سے اپنے انکار کو ظاہر کیا گیا ہے۔

طبری نے صرف اتنا لکھا ہے کہ علی اکبرؑ نے کئی حملے کیے۔ بحار میں ہے۔ فلم یزل یقاتل حتی ضج الناس من کثرۃ من قتل منھم علی اکبرؑ نے اتنی جنگ کی کہ دشمن کثرت مقتولین کی وجہ سے چیخ اٹھے۔

مرہ بن منقذ بن نعمان عبدی نے کہا "اگر اب کی مرتبہ اس جوان نے حملہ کیا اور میری طرف سے گذرا تو میں ابھی اس کے باپ کو اس کے غم میں مبتلا کر دوں گا۔" ایسا ہی ہوا۔

علی اکبرؑ نے جب حملہ کیا مرہ پاس آیا اور نیزہ سینہ پر لگایا۔ علی اکبرؑ

تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

خیمہ حسینی میں اس حادثہ نے تہلکہ ڈال دیا۔ مگر امامؑ کا استقلال دیکھنے کے قابل تھا۔ اُنھوں نے بس اتنا کہا کہ:۔

قتل اللہ قوما قتلوك یا بنیّ ما اجرأھو علی الرحمٰن وعلی رسوله وعلی انتھاك حرمة الرسول، علے الدنیا لبعدك العفا۔

"خدا فنا کر دے اُس جماعت کو جس نے تجھے قتل کیا اے میرے فرزند۔ کتنی جرأتیں بڑھ گیئں ان لوگوں کی خدا اور اس کے رسولؐ کے مقابلہ میں۔ تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے۔"

حضرت نے بنی ہاشم کے نوجوانوں سے فرمایا "بڑھو اپنے بھائی کی لاش اُٹھاؤ۔" سب نوجوان آگے بڑھے اُنھوں نے علی اکبرؑ کی لاش کو لاکر اُس خیمہ کے آگے لٹا دیا جو جنگ کے موقع پر بطور مرکز سپاہ قرار دیا گیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچے بھی اس وقت گھبرا کر خیمہ سے باہر آ گئے تھے، بے رحم دشمن کی فوج کو موقع مل گیا۔ عمرو بن صبیح صیدائی نے عبداللہؑ بن مسلم بن عقیلؑ کو تیر لگایا جو بچہ کی پیشانی کی طرف آیا، بچہ نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ دیا، تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ کسی دوسرے نے بڑھ کر

نیزہ لگایا اور قتل کر دیا۔
دوسرے بعض چھوٹے بچے بھی اسی صورت سے قتل ہوئے۔

تیئیسواں باب

قاسم بن الحسنؑ کی یادگار شہادت

حسینؑ کربلا میں بڑے بڑے اہم اسلامی فرائض کے عملی نمونے پیش کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اُس وقت عبادت کے لیے ایک شب کی مہلت مانگی جب کسی اور کو عبادت کا خیال نہ آسکتا تھا۔ اُنھوں نے اُس قلیل تعداد میں نماز خوف کے اصول پر عمل کر کے دکھلایا جب کوئی اور اس اصول پر عمل کر نہیں سکتا تھا۔ اُنھوں اُس اُس طرح اتمام حجّت کے منازل طے کیے جس طرح کوئی طے کر نہ سکتا تھا، اُنھوں نے ایسے سخت مواقع پر اپنے اصحاب، اعزّا اور اہل حرمؑ کے ساتھ حقوق النّاس کے اُصول کو ملحوظ رکھا جب کوئی ملحوظ نہ رکھ سکتا تھا۔

اسی صورت سے ایک اہم اسلامی فرض یعنی وصیّت پر عمل کر کے ... نے اس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا جس

طرح کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

میں اکثر لکھ چکا ہوں اور پورے طور سے واضح کر چکا ہوں کہ ائمہ معصومین اپنی روزمرّہ کی زندگی اور طرزِ عمل میں اسبابِ ظاہری کے پابند تھے اور جب تک کوئی خاص سبب اظہارِ معجزہ و کرامات کی صورت کا نہ ہو وہ علمِ باطن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور نہ اُس پر عمل کرتے تھے۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ ان دونوں بھائیوں کی محبت آپس میں ویسی ہی تھی جو دنیا کے بھائیوں کے لیے کامل نمونہ بن سکتی ہے محبت کے رشتوں میں قوت اولاد کی باہمی شادی سے ہوتی ہے اور بہرحال شادی کے لیے جس طرح کی بھی اخلاقی و روحانی خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ ایک امامؑ کے تربیت یافتہ فرزند کے واسطے ایک امامؑ کی تربیت یافتہ دختر سے زیادہ نہیں مجتمع ہو سکتے۔

ایک لڑکے کا باپ اور لڑکی کا چچا اُسے ہر طرح سے آرزو اور تمنا بھی ہوتی ہے کہ وہ لڑکی جو بھتیجی ہونے کے لحاظ سے مثل اُس کی اولاد کے تھی ہی، دوسری حیثیت سے بھی اُس کی لڑکی کے مثل بن جائے۔

یہ اسباب تھے جن کے لحاظ سے امام حسنؑ کا آخری وقت اپنے چھوٹے بھائی امام حسینؑ سے یہ وصیت کرنا قرینِ قیاس ہے کہ اُن کے بڑے فرزند حسن مثنیٰ کا عقد اُن کی بڑی بھتیجی کے ساتھ اور چھوٹے فرزند

قاسمؑ کا عقد اُن کی چھوٹی بھتیجی کے ساتھ کیا جائے۔

امام حسینؑ نے بھی اپنے بھائی کی اس آخری وصیت کو منظور کرلیا تھا اور اس طرح یہ وصیت اُن کے لیے نافذ اور واجب العمل ہوگئی تھی۔

بے شک قدیم مؤرخین نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ہمارے مؤرخین کے اتنے بلند پایہ بزرگوں نے انھیں سے درج کیا ہے جن کے درج کردہ دوسرے روایات برابر اشتہار و اعتبار کی نظر سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔

فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے جب تک غیر معمولی اسباب پیدا نہ ہوں شادی کا زمانہ اُس وقت ہے۔ جب پسر و دختر دونوں سن تمیز کو پہونچ جائیں اور بالغ ہو جائیں۔

امام حسنؑ کی وفات کے موقع پر قاسمؑ بہت کمسن تھے۔ اس کے بعد دس برس امام حسینؑ نے مدینہ میں خاموش زندگی بسر کی اور قاسمؑ آپ کی تربیت میں مثل اولاد کے رہے، حسن مثنیٰ کی عمر اُس وقت جوانی کے حدود میں تھی اس لیے ان کی شادی کردی گئی مگر قاسمؑ کی عمر اس وقت تک تیرہ چودہ سال سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ ان اوقات میں ظاہری اسباب کے لحاظ سے شادی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے اور وصیت کے نفاذ میں تعجیل کی کوئی ضرورت

نہیں اس لیے کہ نہ اُس کا موقع آیا ہے اور نہ وقت تنگ ہوا ہے۔

اب وہ موقع آیا کہ جب امامؑ نے سفر عراق کیا۔ تمام مخصوص اعزا آپ کے ساتھ تھے۔ متعلقین بھی ہمراہ تھے۔ آپ کی صاحبزادیاں جو اکثر مورخین کی تحقیق کی بنا پر چار تھیں۔ ان میں سے ایک بیماری کے سبب سے مدینہ میں چھوڑ دی گئی تھیں لیکن تین آپ کے ساتھ موجود تھیں، قاسمؑ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اولاد کے بعد اگر درجہ ہے تو بھتیجوں ہی کا ہے، اور قاسمؑ کا، حضرتؑ کمسن اور یتیم ہونے کی بنا پر اس درجہ خیال کرتے تھے کہ اُتنا خیال اولاد کا بھی شاید نہ فرماتے ہوں۔

سلسلۂ شہداؑ میں میدان جنگ جانے والوں میں طبری وغیرہ کے بیان کے مطابق علی اکبرؑ کے بعد قاسم بن الحسنؑ ہی ہیں۔

قاسمؑ نے امامؑ سے اجازت مانگی اور انتہائی اصرار سے ضد کے ساتھ مانگی۔ علی اکبرؑ کو میدان جنگ بھیجنے میں امامؑ کی جانب سے ذرا بھی توقف نہ ہوا، لیکن قاسمؑ کی اجازت پر امامؑ نے اس درجہ تامل فرمایا کہ ظاہری اسباب سے قاسمؑ کو مایوسی ہو گئی اور وہ محزون و مغموم ہو کر خیمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

مگر امام حسنؑ کے ہاتھ کا ایک تعویذ جو بازو پر بطور وصیت نامہ کے بندھا تھا اُسے کھول کر پڑھنے کا خیال آیا، دل کو ڈھارس ہوئی

(ا)س میں آج ہی کے دن کی خبر تھی اور قاسمؑ کو اپنی جان نثار کرنے (کی) ہدایت تھی۔

قاسمؑ کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے (اسی) کو اپنے چچا کی خدمت میں بطور سفارش اجازت پیش کیا (ا)س کے بعد امامؑ کو یقین ہو گیا کہ اب قاسمؑ رک نہیں سکتے۔

(ب)ے شک اب ظاہری اسباب کی بنا پر اُس وصیت کے نفاذ (ک)ا وقت مضیق ہو گیا تھا جو حضرت امام حسنؑ نے اپنے بھائی کو کی تھی۔

حسینؑ اسلامی شریعت کے محافظ تھے اور اسلام میں عقد (ن)کاح کوئی رسمی تقریب نہیں ہے جس میں کسی جشن کی ضرورت (ہ)و اور عیش و عشرت کے ہنگام کا انتظار ہو۔

شادی ایک آئینی رشتہ ہے جو شرعی قانون کے تحت (ق)ائم ہوتا ہے اور حسینؑ کے لیے وہ اُس وقت ایک فرض کی (ح)یثیت رکھتا تھا جسے ادا کرنا ضروری تھا۔

شادی بے شک عقلی حیثیت سے اُنہی مقاصد کے لیے (ہ)ے جن کے لیے طرفین کی زندگی کی اُمید بہت ضروری ہے (ل)یکن ان عقلی مصالح کا لحاظ تو اُس وقت سے تعلق رکھتا ہے (ج)ب وصیت ہو رہی تھی اور اُس وقت ہم نے بتایا کہ اسباب (ظ)اہری کی بنا پر وہ کسی طرح عقل کے خلاف نہیں تھی۔

(ا)گر ... چکنا ... اُس کے قبول ہونے کے بعد اب

اُس میں صرف وصیّت کے پورا کرنے اور اُس فرض کو ادا کرنے کا پہلو رہ جاتا ہے جس کے ساتھ کسی اور عقلی مصلحت کی ضرورت نہیں ہے۔

امامؑ اگر ایسا نہ کرتے تو ایک بہت بڑا اسلامی فریضہ تشنہ عمل رہ جاتا۔ اس لیے امامؑ نے اُس تعویذ کو دیکھنے کے بعد اب قاسمؑ کو روکنے کا محل تو نہ پایا۔ لیکن آبدیدہ ہو کر یہ فرمایا کہ اچھا تم اپنے والد بزرگوار کی وصیّت پر عمل کرو۔ "مگر مجھے بھی تو بھائی کی ایک وصیّت ہے۔ اُس کو مجھے پورا کرنا چاہیئے۔"

یہ فرما کر قاسمؑ کا ہاتھ پکڑا اور خیمہ کے اندر لائے۔ تبرکات کے صندوق میں سے بزرگوں کا لباس نکالا اور قاسمؑ کو پہنا کر اپنی اُس صاحبزادی کا جو قاسمؑ کو منسوب تھیں عقد قاسمؑ کے ساتھ پڑھ دیا۔"

یقیناً یہ عقد کوئی تقریب خوشی کی حیثیت تو رکھتا نہیں تھا اُس نے حقیقۃً مصیبت کی عظمت اور اُس کی مذلت میں اضافہ کر دیا تھا۔ عورتیں ایسے حالات سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں اور اس لیے بیوۂ حضرت حسنؑ اور زوجۂ حضرت سید الشہداءؑ پر جتنا بھی اثر نہ ہوتا کم تھا۔ جب کہ معلوم تھا کہ جس کی ابھی شادی ہو رہی ہے وہی ابھی مرنے جاتا ہے۔

یہ عوام کی سخت غلطی اور لفظوں کی کوتاہی ہے کہ وہ قاسمؑ کو
شب کا دولھا اور فاطمہ کبریٰؑ کو ایک شب کی دلھن کہیں اور اُسے
کلام بنالیں حالانکہ حقیقتاً وہ چند لمحوں کا رشتہ تھا جو دنیا
میں موت کے ہاتھوں قطع ہوگیا۔

قاسمؑ کو شہادت کا شوق تھا اس لیے وہ دیر تک ٹھہر نہیں
سکتے تھے۔ سب سے رخصت ہوئے اور عروس سے رخصت
ہوئے۔ جو اُس وقت اگرچہ عروس تھی مگر اُسے پہلے سے قاسمؑ
کے ساتھ وہ انس و محبت موجود تھی جو ایک گھر میں رہنے والے
چچی زاد بھائی اور بہن میں کمسنی کے عالم میں ہونا چاہیے۔ وہ
بھی اپنے بڑے بھائی علی اکبرؑ کو رو چکی تھی اور اب قاسمؑ کو
نے جانے دیکھتی تھی اور وہ خود عروسی کے معنی بالکل نہ جانتی
ہو تب بھی وہ اپنی ماں اور چچی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کسی خاص
طرح قاسمؑ کی موت کو میری بربادی سمجھ رہی ہیں اور اس پر
رو رہی ہیں اور اس لیے جو کچھ بھی صدمہ و اندوہ اُس کمسن
صاحبزادی کو نہ ہوتا وہ کم تھا۔

لیکن قاسمؑ پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔ انھیں جنگ
کا خیال تھا اور اسی کا حوصلہ، بنی ہاشم کے بچے تلواروں سے
کھیل کھیل کر بڑے ہوتے ہیں۔ بچپنے میں انسان جس چیز کی طرف
قاسمؑ احساس

کر رہے تھے کہ میرے بڑے بھائی علی اکبرؑ نے ابھی خوں ریز جنگ کی ہے اور دشمنوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ مجھے بھی جا کر اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے چاہئیں۔

وہ اس کا تصوّر نہیں کرتے ہوں گے کہ میں کمسن ہوں اس لیے بھائی کا میرا کوئی مقابلہ نہیں، بلکہ اُن کا ولولہ یہی ہوگا کہ جو بھائی نے کیا اُتنا ہی میں بھی کروں اور اُن سے کم نہ رہوں۔ اس کے علاوہ اس لشکر نے میرے بھائی کو قتل کر دیا۔ پھر مجھے اُن کے خون کا انتقام لینا چاہیئے۔

میرے بابا نے اسی موقع کی تو وصیت کی تھی۔ پھر مجھے اپنے باپ کی روح کو بھی خوش کرنا ہے۔

بچّے ایسے نادر اور غیر معمولی مواقع سے غمگین ہونے کے بجائے لذّت اندوز ہوتے ہیں، قاسمؑ سمجھ رہے تھے کہ اس وقت مجھے دُہری عزّت حاصل ہو گئی امامؑ نے مجھے داماد بنا لیا۔ مجھے آپ نے اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے ہیں۔

مجھے اس وقت پورے طور سے حق شجاعت ادا کرنا چاہیئے اور لوگ یہ تو کہیں کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے کم نہیں رہا۔

یہ تمام خیالات ہوں گے جن کی بنا پر قاسمؑ کے دل پر نہ تو ماں پھوپھی اور دوسرے اہل حرم کے رونے کا اثر ہوا۔ نہ عروس کے صدمہ کی طرف کوئی توجہ ہوئی۔ وہ رخصت ہوئے اور سب سے

رخصت ہو کر باہر چچا کی خدمت میں گئے کہ اب تو کوئی انتظار نہیں رہا۔ اب تو مجھ کو اجازت میدان کارزار کی دیجئے۔ امامؑ نے شاید بھائی کو یاد کر کے اُس وقت بہت گریہ فرمایا۔ قاسمؑ کے عمامہ کو اپنے ہاتھ سے باندھا اور اُس کے دونوں گوشے سینہ پر لٹکا دیئے۔ اُن کے پیراہن کو بصورت کفن چاک کر دیا۔

قاسم میدان جنگ میں آئے۔ چہرہ مثل ماہ چاردہ کے تھا۔ یہ رجز پڑھنے لگے۔

ان تنکروانی فانا ابن الحسن	سبط النبی المصطفٰے والموتمن
ھذا حسین کالاسیر المرتھن	بین اناس لاسقوا صوب المزن

"اگر تم مجھے نہیں جانتے تو اب معلوم کر لو کہ میں حسنؑ کا فرزند ہوں اور پیغمبرؐ کی اولاد میں ہوں۔ کیا غضب کی بات ہے کہ یہ حسینؑ تمہارے درمیان مثل قیدی کے محصور ہو گئے ہیں۔ خدا کرے ابر باراں اس جماعت کو سیراب کبھی نہ کرے۔"

قاسمؑ نے اپنی عمر کے لحاظ سے غیر معمولی خوں ریز جنگ کی۔ آخر کار دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر گرے اور اپنے چچا کو مدد کے لیے آواز دی، حسینؑ کو بھتیجے کی مدد کے لیے پہونچنا تھا اُنھوں نے غضب ناک شیر کی طرح حملہ کیا اور فرزند رسولؐ کے حملہ سے فوج میں تہلکہ پڑ گیا۔ افسوس ہے کہ اس ہنگامہ میں قاسمؑ کی لاش کو نہایت مصیبت ناک صدمہ پہونچ گیا۔ آخر فوج

منتشر ہوئی اور امامؑ لاش قاسمؑ پر پہونچے۔ انتہائی غم واندوہ کے ساتھ قاسمؑ کی لاش کو بھی لاکر اُسی جگہ لٹایا جہاں علی اکبرؑ کی لاش پہلے سے موجود تھی۔ وہی شادی وہ تھی جس سے قاسمؑ کی شہادت نے ایک مخصوص یادگار حیثیت اختیار کر لی اور جس کو سوچ کر حضرت جاوید مرحوم کو ارشاد فرمانا پڑا۔

حضرتِ قاسمؑ کی شادی بھی عجب شادی ہوئی
دو گھروں کی ان کے مرجانے سے بربادی ہوئی

چوبیسواں ۲۴ باب

شہدائے بنی ھاشمؑ کی تفصیل

بنی ہاشم کے شہداءؑ میں بھی کامل ترتیب قائم کرنا بہت مشکل ہے جہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے اصحاب کی شہادت کے بعد سب سے پہلے حضرت علی اکبرؑ شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت سے ہاشمی نوجوانوں میں ایک خاص جوش پیدا ہو گیا تھا اور اُنھوں نے بوقت واحد حملہ کر دیا، اولاد مسلمؑ و جعفرؑ میں سے چند بہادر اُس وقت قتل ہوگئے پھر قاسم بن الحسنؑ کی شہادت ہوئی اور سب سے آخر میں

اولاد علیؑ بن ابی طالب یعنی برادران حضرت سید الشہدا سلام اللہ علیہ جن میں سب سے آخری شہید حضرت ابوالفضل العباسؑ ہیں اور آپ پر مجاہدین کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

پھر حضرت سید الشہداؑ نے جہاد کیا اور آپ کی شہادت ہوئی۔ اس لحاظ سے اس باب کو ہمیں حضرت قاسمؑ کی شہادت کے پہلے قائم کرنا چاہیئے تھا لیکن چونکہ بہر حال یہ باب غیر مرتب حیثیت رکھتا ہے اس لیے جہاں تک مستند طریقہ سے شہداء بنی ہاشمؑ کے اسماء مل سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

اولادِ مسلمؑ و عقیلؑ

(۱) عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ۔ سابق میں حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد اس بچّہ کی شہادت کا تذکرہ ہو چکا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمسن تھے اور بغیر جنگ کے شہید ہوے مگر بحار میں اُن کی رجز اور جنگ موجود ہے۔ میرے خیال میں پہلی روایت درست ہے۔

(۲) محمد بن مسلم بن عقیلؑ۔ ابصار العین فی انصار الحسینؑ میں ہے کہ

حمل بنو ابی طالب بعد قتل عبد اللّٰہ حملۃ واحدۃ نصاح بھم الحسین صبراً علی الموت. یا بنی عمومتی فوقع فیھم

عبداللہ کے قتل ہونے کے بعد ابوطالبؑ کی اولاد نے ایک ساتھ حملہ کر دیا امامؑ نے آواز دی ہاں میرے چچا کے فرزندو موت کے مرحلہ کو سر کرو

محمدؑ بن مسلم قتلہ ابو مرھم الازدی و لقیط بن ایاس الجھنی۔ | چنانچہ ان میں سے محمد بن مسلمؑ شہید ہو کر گر گئے۔ اُن کو ابو مرہم ازدی اور لقیط بن ایاس جہنی نے قتل کیا۔

(۳) عبدالرحمٰن بن عقیلؑ۔ ابن شہر آشوب کا بیان ہے:۔

تقدم فی حملۃ آل ابی طالب بعد الانصار وھو یقول۔ "وہ آل ابوطالب والے حملہ میں جو انصار کے بعد ہوا بڑھے اور یہ کہہ رہے تھے:۔

ابی عقیل فاعرفوا مکانی | من ھاشم وھاشم اخوانی

"میرے باپ عقیلؑ ہیں۔ تم کو جو میری قرابت ہے ہاشم سے اُسکو جاننا چاہیئے اور معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام بنی ہاشم میرے بھائی ہیں"۔

اس کے بعد جنگ کی اور سترہ آدمی قتل کیے پھر دشمنوں نے گھیر کر اُن کو قتل کیا، اُن کے قاتل عثمان بن خالد بن اشیم جہنی اور بشر بن حوط ہمدانی تھے"۔

(۴) جعفر بن عقیل بن ابی طالبؑ۔ انھوں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا الغلام الابطحی الطالبی | من معشر فی ھاشم من غالب

ونحن حقاً سادۃ الذوائب

"میں مکّہ کا رہنے والا، طالب کے خاندان کا، ہاشم کی نسل سے اور غالب کے گھرانے سے ہوں۔ یقیناً ہم ہی تمام قبائل کے سردار ہیں"۔

پندرہ آدمی فوج مخالف کے قتل کئے اور بشر بن حوط کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

اولاد جعفرؑ

(۱ و ۲) عونؑ و محمدؑ فرزندان عبداللہ بن جعفرؑ۔ ان دونوں مجاہدوں کی نسبت مرثیہ نگاروں میں اور اُن کی وجہ سے عام اشخاص میں یہ روایت شہرت پاگئی ہے کہ یہ دونوں حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے فرزند، امام حسینؑ کے بھانجے تھے۔

اس کے برخلاف اہل علم کی زبان سے اکثر یہ سُنا گیا اور خواص کے طبقہ میں یہ مشہور ہو گیا کہ یہ روایت بالکل غلط ہے اور یہ دونوں حضرت عبداللہ بن جعفرؑ کے صاحبزادے تھے مگر جناب زینبؑ کے بطن سے نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں درست نہیں ہیں۔ حقیقۃً محمدؑ تو جناب زینب کے بطن سے نہیں تھے، اُن کی والدہ کا نام تھا خوصاء بنت حفصۃ بن ثقیف بن ربیعۃ بن عائذ بن ثعلبۃ بن عکابۃ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل۔ خوصاء کی ماں تھیں ہند بنت سالم بن عبدالعزیز بن مخزوم بن سنان بن مولۃ بن عامر بن مالک بن تیم اللات بن ثعلبۃ ہند کی ماں تھیں۔ میمونہ بنت بشر بن عمرو بن حارث بن ذہل بن شیبان۔

مگر عونؑ جناب زینبؑ ہی کے بطن سے تھے۔ بے شک ان

بہت کمسن بھتے درست نہیں معلوم ہوتی، اگرچہ اُن کے سن کے متعلق کوئی قطعی حد بندی نہیں کی جاسکتی مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوانی کے حدود میں تھے اور جناب قاسمؑ کی طرح سے کمسن نہیں تھے۔

روزِ عاشور پہلے محمد میدانِ جنگ میں گئے ۔۔۔۔ اُنھوں نے یہ رجز پڑھا۔

اشکوا الی اللہ من العدوان	فعال قوم فی الردی عمیان
قد بدلوا معالم القرآن	ومحکم التنزیل والتبیان

"خدا سے شکوہ کرتا ہوں دشمنوں کے ظلم وجفا کا۔ اس قوم کے افعال کا جو اندھی بنی ہوئی ہلاکت کے گڑھے میں جارہی ہے۔ انھوں نے قرآن کے نمایاں احکام کو بدل دیا اور کھلی ہوئی قرآنی آیتوں میں تبدیلی کی۔"

جنگ کی اور دس آدمی قتل کیے آخر عامر بن نہشل تمیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

ان کے بعد عون بن عبد اللہؑ میدان میں آئے اُن کا رجز یہ تھا

ان تنکرونی فانا ابن جعفر	شھید صدق فی الجنان ازھر
یطیر فیھا بجناح اخضر	کفی بھذا شرفا فی المحشر

"اگر مجھے نہ جانتے ہو تو پہچان لو کہ میں جعفرؑ کی اولاد ہوں۔ وہ جعفرؑ جو حق کے راستہ میں شہید ہوئے۔ جن کو خدا نے بہشت میں بال و پر عطا فرمائے کہ وہ مثل ملائکہ کے پرواز کریں۔ اُن کے شرف

کے لیے اتنا بہت کافی ہے۔

تینؔ سوار اور اٹھارہؔ پیادے قتل کرنے کے بعد عبداللہ بن قطنہ طائی کی تلوار سے درجہ شہادت پر فائز ہوے۔

بعض کتب میں عون و محمد فرزندان جعفرؑ کی شہادت بھی کربلا میں مذکور ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حقیقۃً عونؑ اور محمدؑ عبداللہ بن جعفر ہی کے فرزند تھے جو کربلا میں شہید ہوے، لیکن وہ محمدؑ جو ان کے چچا تھے وہ کربلا سے بہت قبل جنگ صفین میں اور عون اس کے بھی پہلے قتل ہو چکے تھے۔

---

۲۵ پچیسواں باب

قمر بنی ہاشمؑ اور ان کے بھائی

چار فرزند امیر المومنینؑ کے ام البنینؑ فاطمہ بنت حزامؓ کے بطن سے تھے:-

(۱) حضرت عباس بن علیؑ، جو ان میں سب سے بڑے تھے۔

(۲) عبداللہ بن علیؑ بن ابی طالبؑ

(۳) عثمان بن علیؑ بن ابی طالبؑ

(۴) جعفر بن علیؑ بن ابی طالب جو سب میں چھوٹے تھے۔

ان تینوں مؤخر الذکر بھائیوں کے کوئی اولاد نہیں تھی روز عاشور حالت یہ تھی کہ ہر شخص اپنے سے وابستہ انسان کو خود اپنے سامنے میدان میں بھیجتا تھا اور اُسے بطور تحفہ اپنے ہاتھ سے پیش کرتا تھا۔ پھر خود آگے بڑھ کر جان دے دیتا تھا۔ عابس بن ابی شبیب کے واقعہ میں اس کی مثال دیکھ چکے اور اُن کے الفاظ بھی سُن لیے۔ کہ انھوں نے اپنے غلام شوذب سے کہا:۔ "میں چاہتا ہوں تمھاری مصیبت کو اُٹھا کر اجر و ثواب کا مستحق بن لوں پھر خود میدان جنگ میں جاؤں"

خود حضرت سید الشہداءؑ نے یہی کیا کہ جب تک کوئی بھی ایسا رہا جو آپ کے سامنے شہید ہو۔ اس وقت تک آپ نے خود اپنی جان نہیں دی

جناب عباسؑ نے بھی اسی طرح روز عاشور اپنے بھائیوں کو یکے بعد دیگرے بلایا اور ایک ایک کو جنگ کے لیے بھیجا۔

سب سے پہلے آپ نے عبداللہ کو بلایا جو آپ کے بعد دوسرے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ فرمایا:۔

تقدّم یا اخی حتّیٰ اراک قتیلاً و احتسبک فانّہ لا ولد لک۔

"بڑھو بھائی آگے بڑھو تاکہ میں تمھیں قتل ہوتے اپنی آنکھ سے دیکھ لوں اور اپنے لیے سامان آخرت سمجھوں۔ کیوں کہ تمہارے تو کوئی اولاد ہی نہیں۔"

ہمارے بیان کیے ہوئے نظام اور صورت واقعہ کو دیکھتے ہوئے اس آخری ٹکڑے کے معنی یہ ہیں کہ "اگر تمہارے اولاد ہوتی تو تم اس کا انتظار کرتے کہ پہلے اپنے بیٹے کو اپنے سامنے قتل ہونے دوں پھر خود جاؤں مگر تمہارے کوئی اولاد تو ہے نہیں جس کے لیے تم انتظار کرو تو جاؤ۔ خود ہی جاؤ۔ میدان جنگ میں۔"

انتہائی کم عقلی سے کام لیا ہے جن لوگوں نے "تمہارے کوئی اولاد نہیں ہے" کے فقرہ کے یہ معنی قرار دیے کہ تم پہلے قتل ہو جاؤ تاکہ میں تمہاری میراث حاصل کروں اور اُس کو اپنی اولاد کے لیے بطور متروکہ چھوڑ جاؤں۔"

اس خود غرضی کی نسبت حضرت عباسؑ کی طرف وہی دے سکتا ہے جو آپ کے مرتبہ سے واقف نہ ہو اور پھر جب کہ الفاظ سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حتی اراك قتيلا واحتسبك "میں تم کو مقتول دیکھوں اور اُسے اپنے لیے سبب اجر سمجھوں۔" اسی کے بعد "فانه لا ولد لك" اس لیے کہ تمہارے اولاد نہیں۔ میراث ملنے کو گذشتہ کلام سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اگر معاذ اللہ حضرت عباسؑ کا یہ مقصد ہوتا بھی تو یہ بات کہنے کی نہیں تھی کہ تم کو میں پہلے اس لیے بھیجتا ہوں تاکہ تمہاری میراث کا مالک ہوں۔

بہر حال یہ خیال بالکل غلط ہے اور حقیقی مفہوم کلام کا وہی ہے جس کا تذکرہ کیا گیا۔

عبداللہؑ میدان میں آئے اور جنگ کرنے کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی کی تلوار سے شہید ہوئے۔

اب جناب عباسؑ دوسرے بھائی عثمانؑ کی جانب متوجہ ہوئے اور انھیں میدان جنگ میں بھیجا۔ عبداللہؑ آگے بڑھے اور جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

پھر تیسرے سب سے چھوٹے بھائی جعفر کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ "جاؤ جیسے تمہارے دونوں بھائیوں کا صدمہ میں نے برداشت کیا ویسے تمہارا بھی برداشت کروں کیوں کہ تم میں سے کسی کے بھی اولاد نہیں ہے"

جعفرؑ نے بھی جہاد کیا اور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

اب جس وقت کہ بھائیوں میں بھی کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہا جو امامؑ کی نصرت کرے اور بنی ہاشم کے مجاہدین سب تمام ہو گئے تو اب حضرت ابوالفضل العباسؑ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگی۔ امامؑ نے اپنے بھائی کو بہت حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا "تم تو میرے علم دار ہو!"۔ عباسؑ نے عرض کیا "اب مجھ سے ضبط ممکن نہیں اور زندگی سے سیر ہو گیا ہوں"۔ امامؑ نے فرمایا "اچھا ارادہ ہی کر لیا ہے جنگ کا

تو پانی کی فکر کرنا۔"

عباسؑ اس کے پہلے بھی ایک مرتبہ عاشور کے قبل فرات پر جنگ کر کے پانی لا چکے تھے اور "سقا" کے لقب کے بھی مستحق ہوے تھے۔ اس وقت پھر انھوں نے مشک لے لی اور دشمن کی فوج پر حملہ کیا۔ اس طرح نہیں کہ گویا انھیں جنگ ہی منظور ہے۔ بلکہ اس طرح جیسے وہ نہر کا راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں اور نہر پر جانا منظور ہے۔

علیؑ کے بیشہ کا شیر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ وہ نہر پر پہونچا بھی اور مشک کو پانی سے بھرا بھی۔ بے شک خود عباسؑ پیاسے تھے اور بہت پیاسے۔ انھوں نے ہاتھ میں پانی کا چلّو اس طرح لیا جیسے پینا چاہتے ہیں مگر امامؑ کی پیاس یاد کر کے فوراً چلّو ہاتھ سے پھینک دیا اور پیاسے نہر سے نکل آئے۔ بھری ہوی مشک دوش پر لیے خیمہ کی جانب روانہ ہو گئے مگر فوج عمر سعد جیسے اپنی شکست کا غصّہ بھی تھا اب پورے اجتماع کے ساتھ سدّ راہ ہوی۔ عباسؑ کی آزادی جنگ میں باقی نہ تھی ان کے دوش پر مشک موجود تھی جس کے ساتھ وہ لڑ نہیں سکتے تھے۔ مگر واہ رے بہادر کہ اُس نے اُسی عالم میں جنگ کی۔ وہ جوش و خروش سے حملے کر رہے تھے اور ان کی زبان پر یہ شعر تھے:۔

لا ارھب الموت اذ الموت زقا حتی اواری فی المصالیت لقی

انی انا العباس اغدو بالسقا ولا اھاب الموت یوم الملتقی

"میں کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ موت کتنے ہی نعرے لگائے جب تک کہ میں تلواروں کے سایہ میں زمین پر نہ گر جاؤں۔ میں عباسؑ ہوں، مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور جنگ کے ہنگام میں موت کی کوئی پرواہ نہ کروں گا۔"

آخر دشمنوں نے احساس کر لیا کہ جب تک عباسؑ کے ہاتھ موجود ہیں کامیابی مشکل ہے۔ حکیم بن طفیل طائی سنبسی نے کمین گاہ سے آکر داہنے ہاتھ پر تلوار لگائی۔ عباسؑ کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا۔ انھوں نے علم کو گرنے نہیں دیا بائیں شانہ پر لیا اور یہ کہا:-

واللّٰہ ان قطعتم یمینی انی احامی ابدا عن دینی

"خدا کی قسم اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں اب اپنے دین کی حمایت نہ کروں گا۔ اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا رہوں گا۔"

زید بن ورقا جہنی نے بائیں ہاتھ پر بھی تلوار لگائی اور اُسے قطع کر دیا۔ عباسؑ نے علم کو اپنے سینہ سے لگایا اس کے ساتھ قبیلۂ تمیم کے ایک شخص نے سر پر ایک گرز لگایا جس سے جناب عباسؑ زمین پر گرے۔

امامؑ پر اس کا کیا اثر ہوا؟ اس کا اظہار غیر ممکن ہے۔

وہ مثل باز شکاری کے جھپٹے اور زخمی بھائی کی لاش پر پہنچے۔ دیکھا دونوں ہاتھ قطع ہیں پیشانی شکستہ ہے آنکھ پر تیر ہے۔ زخموں سے چور ہیں۔ امامؑ جھک گئے اور سرہانے بیٹھ گئے یہاں تک کہ شیر دل بھائی کی رُوح نے جسم سے مفارقت کی، اب کوئی اور نہیں تھا جس کا حسینؑ کو سہارا ہوتا وہ بھائی کی لاش سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے، تلوار ہاتھ میں تھی۔ جوش و خروش کا عالم تھا دائیں اور بائیں دشمن پر حملہ کر رہے تھے۔

اور تاریخ کے الفاظ یہ ہیں:۔

یفترون بین یدیہ کما تفرّ المعزیٰ اذا شدّ الذئب۔

"وہ اس طرح سے آپ کے سامنے سے بھاگ رہے تھے جیسے بکریاں بھاگتی ہیں اُس وقت جب بھیڑیا حملہ کرے"۔

اور امامؑ کہہ رہے تھے:۔

این تفرون وقد قتلتم اخی | این تفرون وقد فتتّم عضدی

"اب بھاگتے کہاں ہو۔ تم نے میرے بھائی کو تو مار ڈالا۔ بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بازو کو توڑ ڈالا"۔

اس کے بعد آپ اپنی جگہ پر آ کر تنہا کھڑے ہو گئے۔

ابصار العین میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

کان العباس آخر من قتل من المحارب لاعداء الحسین علیہ السلام ولم یقتل بعدہ الا الغلمان الصغار من آل ابی طالب الذین لم یحملان سلاح۔

"عباسؑ سب سے آخری شخص تھے جو دشمنان اسلام سے جنگ کر کے شہید ہوئے۔ اُن کے بعد جو قتل ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے بچے آل ابوطالبؑ میں سے تھے جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔

۲۶
چھبیسواں باب

شش ماہہ بچہ کی عظیم الشان شہادت

بچہ، بہت کمسن بچہ، شیر خوار بچہ، بے زبان بچہ۔ عبداللہؑ نام تھا اور امام علیؑ نے چونکہ اپنے سب بچوں کا نام علی رکھا تھا۔ اس لیے علی اصغرؑ بھی کہا جاتا تھا۔ شہید چھوٹا تھا مگر اس کی شہادت اتنی عظیم ہے کہ در حقیقت اگر کربلا میں یہ شہادت واقع نہ ہوتی تو اُس کی عظمت میں ایک بہت بڑی کمی ہو جاتی۔

ماں باپ کو چھوٹے بچّوں سے انتہائی محبّت ہوتی ہے امام جب شہادت پر عازم ہوگئے تو در خیمہ پر آ کر اس بچہ کو دیکھنے کے لیے اہل حرمؑ سے منگوایا۔

بچہ پیاسا ضرور تھا اور یقیناً بہت پیاسا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے دشمنوں سے اُس کے لیے پانی مانگا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ یہ بھی نہیں تھا بلکہ صرف آپ بچّہ کو گلے سے لگائے ہوئے اُسے رخصت کر رہے تھے۔ مگر بے رحم دشمن کو یہ بھی گوارا نہیں ہوا۔

زمین آسمان کانپ گئے۔ انسانیت نے فریاد کی۔ رحم کی آٹھ آٹھ آنسو روئی۔ جب حرملہ بن کاہل اسدی نے تیر چلّہ کمان میں جوڑا۔ بچہ کی گردن پر لگایا اور بچّہ اپنے باپ کے آغوش میں تمام ہوگیا۔

یہ حسینؑ کا آخری ہدیہ تھا جو خدا کی بارگاہ میں اس طرح پیش ہوا اور اب حسینؑ کے لیے صرف اپنی جان کا مرحلہ تھا جس کے طے کرنے کے لیے وہ بہت پہلے سے تیار تھے۔

ستائیسواں باب

جہادِ آخر اور شہادت

اب علی اصغرؑ کو نذرِ راہ خدا کرنے کے بعد حسینؑ کے پاس کوئی ایسی قربانی نہ تھی جسے وہ حق کی بارگاہ میں پیش کرتے۔

اب آپ خود رخصت آخر کے لیے خیمہ میں تشریف لائے اور ایک یمنی چادر کو جابجا سے چاک کر کے باقی لباس کے نیچے پہنا۔ شاید اس لیے کہ بعد شہادت جب لباس کو لوٹا جائے تو بوسیدہ ہونے کی وجہ سے یہ کپڑا جسم پر رہ جائے۔ اس کے بعد میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ آپ غمزدہ، دل شکستہ، تشنہ و گرسنہ ہونے کے باوجود تن تنہا جب تلوار کھینچ کر فوج مخالف پر حملہ آور ہوئے تو وہ یادگار شجاعت دکھائی کہ انسانی حافظہ میں قیامت تک کے لیے اس کی یاد محفوظ ہو گئی یہاں تک کہ فوج مخالف پر آپ کا وہ رعب چھا گیا کہ کوئی آپ کے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔[1]

یزیدی افواج کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر شمر نے فوج کو للکارا

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۰

اور نئے سرے سے ترتیب لشکر کو درست کر کے سواروں کو پیادوں کے پیچھے کھڑا کیا اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ تیر باران کریں۔ اتنی شدت سے تیر برسائے گئے کہ حضرتؑ کے جسم پر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے سیاہی کے کانٹے ہوتے ہیں۔ اسی وقت دوبارہ شمر نے چلا کر کہا "خدا تم سے سمجھے، کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ قتل کیوں نہیں کرتے۔ خدا کرے تمہاری مائیں تمھیں روئیں"۔

اس طرح کی سرزنش ہونے پر وہ لشکر بے کراں امامؑ پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑا اور آپ پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینھ برسنے لگا ——— آخر آپ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے مگر پیادہ ہونے کے بعد آپ نے مقابلہ جاری رکھا۔

اسی اثناء میں بے حیا لشکر یزید کا ایک دستہ اپنی شکست کی خفت کو مٹانے کے لیے شمر کی قیادت میں خیام حسینیؑ کی جانب متوجہ ہو گیا اور آپ کے اور خیام کے بیچ میں حائل ہو گیا اس پر آپ نے فوج کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمھیں دین کا لحاظ اور آخرت کا تصوّر نہیں ہے تب بھی دنیا میں اپنی قومی شرافت کا پاس تو کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے خیام سے تعرض کیوں کرتے ہو ——؟ یہ سن کر شمر بھی اپنی حرکت

پر کچھ شرمندہ ہوا اور خیام کی طرف سے فوج کو پلٹا لایا۔

اب شمر نے پیادوں کو اپنے ساتھ لے کر خود آپ کا محاصرہ کر لیا مگر عالم یہ تھا کہ جس طرف آپ رُخ کرتے تھے اُدھر کی جماعت منتشر ہو جاتی تھی۔ غالباً اسی موقع کا تذکرہ فوجِ دشمن کے ایک سپاہی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"میں نے کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو زخمی ہو چکا ہو اور اس کے اولاد، عزیز اور ساتھی سب قتل ہو چکے ہوں اور پھر وہ حسینؑ کا ایسا مطمئن اور ثابت قدم نظر آئے اور اُن کی سی جرأت و ہمّت سے مقابلہ کرے" حالت یہ تھی کہ پیادے چاروں طرف سے اُنھیں گھیرتے تھے اور وہ تلوار لیکر ان پر حملہ کر دیتے تھے تو وہ سب داہنے بائیں سے یوں ہٹتے تھے جیسے گوسفندوں کا غول بھیڑیے کے حملہ کے وقت منتشر ہو۔

مگر رفتہ رفتہ حملوں میں شدّت ہوتی گئی اور آخر حضرتؑ زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر گئے۔ یہ وہ موقع تھا کہ آپ کے دل پر ایک آخری داغ پڑا۔ آپ کا چھوٹا بھتیجا عبداللہ بن الحسنؑ، یہ صاحبزادہ قاسمؑ سے بھی چھوٹا تھا۔ بے تاب ہو کر خیمہ سے نکلا۔ حضرت زینبؑ نے بہت روکنا چاہا مگر آپ کسی طرح نہ رُکے اور دوڑتے ہوئے امامؑ کے پاس پہونچ گئے۔ اس وقت بحر بن کعب حضرتؑ پر تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا۔ جوں ہی اُس نے

تلوار ماری آپ نے اپنا ہاتھ درمیان میں کر دیا۔ تلوار نے ہاتھ کو کاٹ دیا۔ بچہ نے بے ساختہ کہا یا اماہ۔ امامؑ نے اپنے سینہ سے لگا لیا اور فرمایا بیٹے صبر کرو اس مصیبت پر۔ تم بھی اپنے بزرگوں کی خدمت میں جا رہے ہو۔ ابھی آپ یہ فرما ہی رہے تھے کہ حرملہ نے تیر لگایا جس سے عبد اللہ شہید ہو گئے۔

اس کے بعد وہ منزل آگئی جب امامؑ کا عالم یہ تھا کہ آپ کی شہادت کے آخری مرحلہ کو انجام دینے میں بظاہر کوئی امر مانع نہ تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس ظلم شدید کے ارتکاب کی جرأت کوئی نہیں کر رہا تھا جس پر شمر چیخا کہ آخر اب کیا انتظار ہے اس پر مالک بن نسر بدی آگے بڑھا۔ اس نے آپ کے سر مطہر پر تلوار لگائی جو سر کے اندر اُتر گئی اور پھر زرعہ بن شریک کی تلوار، سنان بن انس کا نیزہ اور سب کے آخر میں خود شمر کا خنجر وہ تھا جس نے سید الشہداءؑ کی اس زندگی کا خاتمہ کر دیا اور "مجاہدہ کربلا" کا پہلا دور جو حضرت امام حسینؑ کی ذات سے متعلق ہے پایۂ تکمیل تک پہونچا۔

آخری باب (۲۸)

شہادت کے بعد

حضرت امام حسینؑ اور آپ کے اقرباؑ و انصارؑ کے شہید کیے جانے پر مظالم کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ آپ جو لباس پہنے تھے وہ بھی اتار لیا گیا۔ پھر خیام اہلبیتؑ پر چھاپا مارا، تمام اسباب و سامان لوٹ لیا حتیٰ کہ مخدرات عصمت کے سروں سے چادریں تک اُتار لیں اور خیموں میں آگ لگا دی۔ اس پر بھی اکتفا نہ ہوی بلکہ نعش مطہرہ کو پامال سم اسپاں کیا گیا۔ سر امامؑ کو خولی بن یزید اصبحی کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس پہلے روانہ کیا گیا۔ اس کے بعد کچھ شہداؑ کے سر قطع کرکے شمر، قیس بن اشعث، عمرو بن الحجاج اور عزرہ بن قیس کے ساتھ روانہ کیے گئے۔

امام حسینؑ کے پسماندگان میں صرف ایک بیمار فرزند علی بن الحسینؑ، پردہ نشین خواتین اور کچھ چھوٹے بچے رہ گئے تھے جو خیموں کے جل چکنے کی وجہ سے رات بھر

کھلے ہوئے صحرا میں مقیم رہے۔

---

۱۱ محرم کو عمر بن سعد نے اپنی فوج کے کشتوں کو جمع کیا اور نماز جنازہ پڑھ کر انھیں دفن کیا گیا مگر شہدائے راہ خدا کی لاشیں اسی طرح بے دفن چھوڑ دیں اور شام ہوتے ہوتے اہلبیت رسولؐ کو بطور قیدیوں کے ساتھ لے کر ابن سعد کوفہ کی جانب روانہ ہو گیا اور بقیہ شہداءؑ کے سروں کو جو تعداد میں بہتر ۷۲ تھے نیزوں پر بلند کر کے ساتھ لے گئے۔

لاشہائے بے سر کو لشکر یزید کے کربلا کے چلے جانے کے بعد قبیلۂ بنی اسد نے جو کربلا سے تھوڑی دور پر غاضریہ میں رہتا تھا، آ کر دفن کیا۔
حضرت امام حسینؑ کو اُسی مقام پر جہاں اس وقت ضریح موجود ہے اور آپ کے پائین پا جناب علی اکبرؑ کو، جناب عباسؑ کو غاضریہ کے راستے پر نہر فرات کے قریب جہاں کہ آپ شہید ہوئے تھے اور دوسرے اعزّا و اصحابؑ کو ایک گڑھا کھود کر یکجا دفن کر دیا گیا۔ جن کے قبور کا وثوق کے ساتھ معیّن کرنا موجودہ ماخذوں کے لحاظ سے غیر ممکن ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ امام حسینؑ کے گرد و پیش ہی

دفن ہیں اور حائر کا احاطہ اُن سب کو گھیرے ہوئے ہے۔
مذکورۂ سابق مظالم پرہی مصائب کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ اس
کے بعد اب کوفہ و شام کے بازار ہیں اور بنی ہاشم کے گھرانے
کی معزز خواتین اور نیزوں پر کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں
کے سر نصب ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو
اہلبیت رسولؐ کے لیے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ
رہے ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حسینؑ کی تبلیغ
منتہائے شباب پر پہونچ گئی ہے اور دعوت حق کا دائرہ
وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اگر چشم حقیقت بین سے نظر کیجئے
تو نیزہ پر سر حسینؑ جس کی پیشانی پر سجدۂ معبود کا نشان پڑا
ہوا ہے سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود چہرہ
سے نور ساطع ہے۔ ہونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول
ہیں (ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا
من ایاتنا عجبا۔) دوسری طرف مخدرات عصمت جوان نامحرموں کے
مجمع میں چادر و مقنع سے محروم ہونے کے بعد بھی غیرت و
حیا کا مجسمہ اخلاق محمدیہؐ کی تصویر جاہ و جلال کی چادروں میں
پنہاں۔ طہارت و عفت کے اندر ملبوس اور اُن کے وہ حقائق
و دقائق سے مملو خطبے کانہا تفرغ عن لسان ابیھا زینبؑ
گویا علی بن ابی طالب کی زبان کے ساتھ کلام کر رہی تھیں۔

یہ چیزیں وہ ہیں جنھوں نے صداقت کے پیکر میں روح پھونک دی دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت وضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا۔ عالم کو شرق سے لے کر غرب تک حسینؑ بن علیؑ کا مرثیہ خواں اور یزید کے افعال و اقوال سے بیزار و متنفر کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آج عالم کے گوشہ گوشہ اور دنیا کے ہر حصہ میں حسینؑ کا نام ہے۔ اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کروڑوں افراد کے دلوں پر قیامت تک کے لیے حکومت کر رہا ہے اور بنی امیّہ کے جبروت و عزت کا چراغ ہمیشہ کے لیے اس طرح گل ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے۔ عالم نے دیکھ لیا کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم؟ ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی شان کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطاہرین۔

تمہید دورِ فلک میں سیکڑوں ہی واقعات ایسے پیش آتے رہتے ہیں جن کے اسباب و علل سمجھنے سے انسانی فکریں عاجز رہتی ہیں، جن کے رازہائے سربستہ ناخنِ ادراک کے لیے عقدۂ لاینحل اور جن کے پوشیدہ اسرار و حقائق ہمیشہ سطحی نظروں سے تاریکی و غموض کے ظلمات بعضہا فوق بعض تہ بہ تہ اور طبق اندر طبق پردوں ہی میں رہتے ہیں۔

انسانی مردم شماری کی طرح اگر دنیا نہیں بلکہ ایک ملک، نہیں ایک صوبہ، ایک شہر کے دن رات کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹوں کے اندر ہر دقیقہ اور ہر ثانیہ میں ہونے والے حوادث کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان میں ایسی تعداد زیادہ ہوگی جن کے علل و مصالح سمجھنے سے عقلِ انسانی قاصر رہی ہے۔

اور درصورتیکہ یہ تمام حوادث ایک مرتب نظام کے ماتحت قادر و حکیم باشعور و ارادہ ہستی کی طرف استناد رکھتے ہیں، یہ سمجھنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ درحقیقت یہ تمام حوادث جن کے اسباب و علل سمجھنے سے ہماری عقل قاصر رہی ہے بجائے خود

مصالح و حکم سے خالی ہیں اور ایک پیر کہن سال کے مرتعش ہاتھ کی حرکت اور سرسامی مریض کی ہذیانی گفتگو یا ایک بے شعور اور لاعقل شخص کی ناسمجھی بوجھی حرکات کے مثل ان میں فوائد و اغراض کا پتہ نہیں، بے شک وہ اشخاص جو ان تمام حوادث کو بے حس و ارادہ بے بصر و بصیرت طبیعت کا ثمرہ اور ذرّات مادہ کے خلط و اختلاط، فعل و انفعال کا نتیجہ سمجھ کر قادر و حکیم علی الاطلاق ہستی کے اعتقاد سے بہ گمان خود مستغنی ہو گئے ہیں، اُن کے لیے میدان صاف ہے، اُن کا ان افعال کو بے شعور و ارادہ طبیعت کی طرف منسوب کرنا خود ہی اس قسم کے بکھیڑوں سے نجات کا ضامن ہے، اصول و عقائد اور رموز و حقائق کی پہلی بحث واحد واجب الوجود قادر و مرید ہستی کے ثبوت کو طے کرنے کے بعد ہی انسان کا قدم ایک نامحدود وسعت سے نکل کر محدود دائرہ میں مقید ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کی سُرعت رفتار جو اب تک ہر قسم کے قیود سے معرّا ہونے کے باعث دنیا کے تیز رو ترین اشیاء سے زیادہ تیزی دکھلانے کا حوصلہ رکھتی تھی اب اپنے کو غیر معمولی قیود کا پابند پا کر اعتدال پر مجبور ہوتی ہے اور راستے کے داہنے بائیں گڑھوں، نالوں، کھوئوں سے بچتے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کے ساتھ ساتھ اس کو بعض ایسے نقطوں پر پہونچ کر رُک بھی جانا پڑتا ہے کہ جن کے آگے

اُس کو چلنے کا راستہ دکھلائی نہیں دیتا۔

انسان کا قدم ایسے تاریک مواقع پر پہونچ کر ٹھٹھکتا ہے
کہ جہاں اس کی عقل کا چراغ جھلملانے لگتا ہے، جس کے آگے
اُس کو تاریکی کا ایک عظیم دریا موجیں مارتا ہوا ملتا ہے جس کو
طے کرنے سے اُس کے تمام موجودہ افکار و قوی قاصر نظر آتے
ہیں، اُس کو ان موقعوں سے دوچار ہونے کے بعد جہل وقصور
کا اعتراف کیے بغیر چارۂ کار نظر نہیں آتا اور اُس کو یہی
کہنا پڑتا ہے سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك
انت العلیم الحکیم اگر حوادث کائنات میں ہر حادثہ کے اسباب
علل سے بحث کو انسان اپنا وطیرہ بنائے تو اُس کو ایسے
مواقع بہت پیش آئیں گے جہاں اُس کو اپنے قصور کا اعتراف
کرتے ہوئے حکیم و قادر ہستی کے مخصوص اسرار و حکم پر محمول ہونے
کی ضرورت پیش آئے گی لیکن چونکہ ان میں سے ہر واقعہ
اپنی عظمت و اہمیت کے اعتبار سے اس قابل نہیں ہوا کرتا
کہ وہ انسانی افکار کو اپنی طرف متوجہ کرے، ایک ہوا کا جھونکا
درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہوا برگ اور فضا میں اُڑتے ہوئے
ابر کی نقل و حرکت اس قابل کہاں کہ فکریں اس کی طرف
متوجہ ہو جائیں اور دنیا اس کے اسباب و مصالح کی فکر میں
غلطان و پیچاں ہو۔

یہ تو اُن حوادث وکائنات کا تذکرہ ہے جو عالم کون و فساد میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور جن کا براہ راست تعلق خالق کائنات کے ارادہ و مشیت سے ہے۔ وہ افعال جو فاعلِ مختار یعنی انسانی افراد سے سرزد ہوتے ہیں، اُن میں ایسے افعال کا پایا جانا خلاف توقع نہیں جو مصالح و فوائد سے خالی بلکہ اس کے برعکس مضار و مفاسد کا موجب ہوں، اسی لحاظ سے عام افراد انسانی کا کوئی طرزِ عمل انتقاد و اعتراض سے بالاتر نہیں ہے بلکہ بیشتر اشخاص کی سیرت اور ان کے افعالُ اعمال اس کے مستحق بھی نہیں کہ اُن کی صحت و عدم صحت کی فکر میں بحث و تمحیص کی زحمت کو برداشت کیا جائے۔

لیکن واقعہ کا تعلق اگر ایک ایسی ہستی کے ساتھ ہو جس کی عظمت عام طور پر مسلّم ہے تو اس میں اہمیت پیدا ہو جانا ناگزیر ہے اور اس وقت اُس کے اسباب و علل اور منافع و فوائد سے بحث عقلا کے افکار کا متفقہ نقطۂ نظر بن جاتی ہے۔ ایسے وقائع کی اہمیت اُس وقت زیادہ ہو جاتی ہے کہ جب وہ کسی مذہبی اعتقاد کا سنگِ بنیاد ہوں اور اُس وقت بھی کہ جب وہ واقعہ اپنی ندرت اور بے مثالی کے باعث دنیا کے واقعات میں خاص درجہ رکھتا ہو اور اُس وقت بھی کہ جب اُس پر با اہمیت نتائج

آئندہ کا مرتب ہونا ...قائم ہو اور ایک اہم تاریخی دور کا پیش خیمہ ہو

ایسے واقعات اگرچہ محیط فلک کی گردش کے ساتھ ساتھ خود فنا ہو جاتے ہیں لیکن اپنے اسباب و علل کی بحث کو عقلائے زمانہ کے افکار کا ایک نامعلوم مدّت کے لیے مشغلہ بنا جاتے ہیں۔

واقعات کربلا اپنی اہمیت کے اعتبار سے عالم کے واقعات میں اپنی آپ مثال ہیں۔ ان میں سے ہر واقعہ اُن تمام وجوہ کو لیے ہوے ہے جو کسی واقعہ کو اہم بنانے کے ذمہ دار ہیں اُن کا تعلق براہ راست ایک ایسی ہستی سے ہے جس کی عظمت شرق و غرب کے کروڑہا انسانوں کے دلوں کو سربسجود بنائے ہوے ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ عالم کی ایک مقتدر اور کثیر التعداد جماعت (شیعہ) اس مقدس ہستی کو امامؑ مفترض الطاعۃ سمجھتی ہے نیز اس حیثیت سے کہ ندرت اور بے مثالی میں اس کی نظیر ازل و ابد کی حدود کے درمیان دیکھنے میں نہیں آئی اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ عظیم انقلابات و تغیرات کا پیش خیمہ قرار پایا، ان وجوہ کی بنا پر کوئی تعجب نہیں کہ یہ واقعات صدیاں گذرنے کے بعد بھی برابر افکار و عقول کے لیے مرکز توجہ بنے رہے اور ہمیشہ ہی ان کے اسباب و علل میں بحث کا سلسلہ قائم رہا

چنانچہ ہمارے سامنے اعتراض یہ پیش ہے کہ جب سید الشہداءؑ کو معلوم تھا کہ وہ اس سفر میں شہید کیے جائیں گے اور آپ کے بعد اہل حرمؑ کی اسیری یقینی ہے تو پھر ان اہلبیتؑ کو اپنے ساتھ

لے کر نکلنے کے کیا معنی؟ کیا یہ خود اپنے ناموس و عزت کو دشمنوں کے ہاتھوں ہتک حرمت کے لیے دے دینا نہیں ہے اور کیا سیاست وعاقبت اندیشی اس بات کی مقتضی نہ تھی کہ آپ ابن عباسؓ اور دوسرے لوگوں کے مشورہ پر عمل کرتے جو اہل حرمؑ کو مدینۂ منورہ میں چھوڑ جانے کے حامی تھے؟

بحث کا پہلا رُخ

مذہبی نقطۂ نظر

اس موقع پر مجھے بہت سے علمائے مذہب کی طرح یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اس قسم کے سوالات کا جن میں ائمۂ دینؑ یا انبیاء مرسلینؑ کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کا عنوان ہو ہمارے مذہبی اصول کی بنا پر موقع ہی باقی نہیں رہتا ہم کو دلائل قطعیہ اور براہین یقینیہ نے ایک ایسے مرکز پر پہونچا دیا ہے جہاں سے امامت و نبوت و توحید کی کڑیاں اس طرح متصل ہو جاتی ہیں جن کے اندر جدائی ناممکن ہے۔ امامؑ پر الزام اُس کی ذات سے تجاوز کر کے رسولؐ تک منتہی ہوتا ہے اور آخر میں ذات احدیت تک سرایت کرتا ہے،

کے بعد اس کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ ان ذوات مقدسہ کے افعال کو محل نقد و اعتراض قرار دیا جائے۔ اُن بزرگان دین کی مثال بالکل ایک ایسے شخص کی ہے جس کو سلطان نے پورے طور پر جانچ کر ایک بڑے منصب کے لیے اہل سمجھ لیا ہو اور اسی اہلیت کی بنا پر۔ اُس کو سفیر بنا کر ایک خاص شہر میں بھیجا ہو کہ وہاں مطلوبہ اغراض و مقاصد کی تکمیل کرے سلطان کی جانب سے اُس کو ایک مخصوص دستور العمل بھی دے دیا گیا ہو جس سے یکسر مو تجاویز کرنے کا اُس کو حق نہیں ہے اسی صورت سے انبیاؑ اور ائمہؑ اپنے دور رسالت و امامت میں ایک خاص دستور العمل کے پابند ہیں جس میں ابتدائے دور سے لے کر انتہا تک ہر وقت کی مناسبت سے مخصوص حکم و مصالح کے ماتحت ایک حکم قرار دے دیا گیا ہے جس کی پابندی اُن پر فرض ہے۔ اور بعض مواقع پر جہاں مقصد کی تکمیل کے لیے قربانی کی ضرورت ہے وہاں جس قسم کی قربانی ضروری ہو وہ بھی اُن کے فرائض میں داخل ہے۔ ان حکم و اسرار سے جو اس قسم کے احکام کا منشاء ہیں رعیت کو بحث کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر یہ طریقۂ گفتگو (اصولی حیثیت سے کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو) موجودہ زمانہ کی آب و ہوا کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

آج کے زمانہ کا معترض اس طرح کا جواب سُن کر اپنے اعتراض

کی حقانیت کا زیادہ معتقد ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی جواب ممکن ہی نہیں ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حسین ؑ بن علی ؑ کی شخصیت پر معترض کے نقطۂ خیال اور زاویۂ اعتقاد کے مطابق نظر ڈالوں۔

بحث کا دوسرا رُخ

فلسفی حیثیت

میں حسین ؑ کو صرف اس حیثیت سے دیکھتا ہوں کہ وہ ایک بلند مرتبہ عالی نسب، باہمت انسان اور ایک محترم قبیلہ (بنی ہاشم کے بزرگ خاندان اور سردار ہیں جو اپنے کو حسب و نسب اور اُن اوصاف و کمالات کے باعث جو انھیں حاصل ہیں یزید سے زیادہ خلافت و سلطنت کا مستحق سمجھتے ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہے کہ جس صورت سے بھی ہو یزید سے کہ جو بلا استحقاق غاصبانہ طور پر مسند حکومت کا مالک بنا بیٹھا ہے اپنے حق کو حاصل کر لیں یا کم سے کم خود یزید کو خلیفۂ وقت تسلیم کر کے اُس کی بیعت میں داخل نہ ہوں جب کہ یزید کے رُسوا کُن عالم افعال آفتاب سے زیادہ روشن ہیں اور یہ امر پایۂ ثبوت تک پہونچ چکا ہے کہ

اگر یزید اسی صورت سے خلافت اسلامیہ پر قابض رہا تو کچھ ہی دن میں شعائر اسلامیہ نیست و نابود اور شریعت نبویہ کے فرائض و سنن نسیاً منسیاً ہو جائیں گے۔ اسلامی افراد کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ چکے تھے الناس علی دین ملوکھم کے عام قانون کے مطابق ہر شخص کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی میں خاص لذت محسوس ہونے لگی تھی، وہ اشخاص جن کے دل میں احساس مذہبی باقی تھا سلطنت کے خوف اور اپنی کمزوری کے باعث سکوت پر مجبور تھے۔ ان حالات کے اندر حسینؑ یزیدی سلطنت کا تختہ اُلٹنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اُن کا آخری نقطۂ نظر یہ بھی نہیں تھا کہ خود تخت حکومت پر بیٹھ کر دنیا کے مال و منال اور لذت حیات دنیا سے متمتع ہوں بلکہ اُن کا مقصود اصلی یہ ہے کہ اُمت اسلامیہ کو اس ظالم کے فولادی پنجہ سے رہا کریں جس نے اس کو دینی و دُنیوی ہر قسم کی ہلاکت میں ڈال رکھا ہے اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ رائے عامہ کو یزید کے خلاف برافروختہ کر دیں، جمہور مسلمین، تمام رعایا کے سامنے یزید کی اخلاقی پستی اور اسلام دشمنی کو مجسم صورت میں پیش کریں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ یہ شخص کسی صورت سے سلطنت مسلمین کا حقدار نہیں ہے۔ امام حسینؑ کو اس مقصد کے حصول میں اس سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ وہ اپنے نفس کو

خطرات کے مقابلہ میں پیش کر دیں، اپنے کو ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بنا کر عالم کے سامنے ظالم اور مظلوم کا انتہائی حیرت انگیز مرقع دکھلائیں جس میں ایک طرف حق و صداقت، رحم و کرم، اخلاص و عمل اور وفا، ثبات قدم، جاں بازی، صبر و تحمّل اور دوسری طرف ظلم و ستم جفا کاری، قساوت قلب، بے حمیتی، کم ظرفی، وحشیت و حیوانیت کا مکمل نقشہ موجود ہے اور اس کے سبب سے مسلمانوں کے دلوں پر وہ چوٹ پڑے جس کا نتیجہ انقلاب سلطنت کی صورت میں نمایاں ہو۔ صرف قتل ہو جانا اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا، عرب قوم میں بات پر مر مٹنا ایک معمولی بات تھی، عربی جاں بازوں کی آخری سانسیں اکثر تلواروں ہی کی چھاؤں میں .... چلتی تھیں، پھر فرزند رسولؐ بھی اگر اپنی جان سے گزر کر قتل کو منظور کر لیتے تو اس کو کوئی خاص اہمیت عام نفوس میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ حسینؑ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اہل حرمؑ کو اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا، عورتوں اور بچّوں کے ساتھ ہمدردی انسانی طبائع میں فطری طور پر داخل ہے اور بالخصوص عرب قوم میں غیرت و حمیّت کے تحت میں یہ جذبہ خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ فرزند رسولؐ یزید اور اُس کے بندۂ زر اتباع سے یقین رکھتے تھے کہ وہ بخیال خود فتح پانے کے بعد ان بے والی و وارث عورتوں کے ساتھ رحم و کرم کا کچھ بھی خیال نہ کریں گے اور مظالم

مصائب کا سلسلہ ان اہل حرمؑ کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رہے گا۔ خاندان رسولؐ کے مخدرات مختلف شہروں میں پھرائے جائیں گے، قید خانہ میں مقید کیے جائیں گے اور اُن کے ساتھ ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھا جائے گا۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ فوراً نہیں تو کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھُلیں گی اور دلوں میں جذبات حزن وملال سے تلاطم برپا ہوگا۔ یقینی بنی اُمیّہ کی سلطنت تباہ ہوگی، حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوے۔ ظاہری صورت ہے تو یزید نے حسینؑ اور اُن کے تمام انصار واعوان کو قتل کرڈالا لیکن حقیقتہً حسینؑ نے یزید اور تمام بنی اُمیّہ کو اُن کی پوری سلطنت سمیت قتل کیا، حسینؑ کی فتح ہوی اور یزید کی شکست اور شکست بھی ایسی کہ روز قیامت تک جس کے بعد فتح نصیب نہیں ہوسکتی۔

سیدالشہداءؑ کا تبلیغی نقطۂ نظر

امامؑ کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے؟ بے شک معلوم تھا بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ تمام اعوان و انصار اعزا حتیٰ کہ شیرخوار بچہ بھی باقی نہ رہے گا۔ مردوں میں سوا ایک بیمار فرزندؑ کے کوئی نہ بچے گا سب دوپہر کے عرصہ میں قتل ہوجائیں گے، یہ بھی یقینی تھا کہ بنی اُمیّہ آپ کے قتل کو مختلف لباس پہنا کر دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ آپ کا قتل مذہبی قوانین کے

لحاظ سے قابل اعتراض نہیں بلکہ اصول کے مطابق ہے اور یہ کہ حسینؑ خلیفہ وقت پر خروج کے باعث اس کے مستحق تھے کہ اُن کو قتل کیا جائے۔ عراق میں امیر المومنینؑ کی چند روزہ خلافت ظاہریہ کی بدولت اہلبیت رسولؐ کو پہچاننے والے کچھ نہ کچھ تعداد میں موجود تھے لیکن شام نے اسلامی دنیا میں آنکھ کھول کر سوا اموی سلاطین اور اُن کے جاہ و حشم کے کچھ نہ دیکھا تھا، اُن کے کان علی ابن ابی طالبؑ پر سب و شتم کو نماز کے وظائف اور جمعہ کے خطبوں میں سُننے کے عادی تھے اور اُن میں سے بیشتر افراد اس مقدس ہستی اور خاندان رسولؐ کے محترم افراد کو پہچانتے بھی نہ تھے اُن میں سے ایسے بھی تھے کہ جب اُن سے پوچھا جاتا تھا یہ کون شخص ہے جس پر بعد نماز سب و شتم کی جاتی ہے؟ تو وہ کہتے تھے (ارا ہ لصامن لصوص العرب) میرے خیال میں تو یہ عربستان کے ڈاکوؤں میں سے کوئی شخص ہے۔ (عقد فرید) ان حالات کی موجودگی میں کوئی شبہ نہیں کہ ادھر حسینؑ قتل ہوئے اُدھر واعظین اور خطبار کی زبانیں خلیفۂ وقت کے طرز عمل کو سراہنے اور اُس کے حق بجانب ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتیں اور اُس وقت غزالی کا رُسوائے زمانہ مقولہ (قتل الحسین لبشرع جدہ) بالکل عام افراد مسلمین کی نظر میں

حقیقت کا لباس پہن لینا۔ اس صورت میں سید الشہداءؑ نے اپنی جان و مال، اولاد سب کو شرع اسلامی کے احیاء اور اپنی مذہبی خود داری کی نگہداشت میں صرف کرتے، لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ کہ تاریخ کے ورق اور کتب سیر کے صفحات یزید کو (مثل دیگر جنگ آزما ہستیوں کے) غازی اور مجاہد کا لقب دے دیں اور پیکر حقیقت، روح صداقت، امام بالحق حسینؑ بن علیؑ دنیا میں ہمیشہ کے لیے مجرم اور باغی مستحق قتل سمجھ لیے جائیں، کیا حسینؑ کا تدبّر اس کی اجازت دے سکتا تھا؟ کیا وہ اپنی جان کو ہاتھ سے دیتے ہوئے مقصد کو بھی ہاتھ سے دے دیتے؟

یہ قتل حسینؑ بن علیؑ کا صرف اُن کا قتل نہ ہوتا بلکہ اُن کی تحریک، اُن کے مقصد، اُن کی ہر دلعزیزی، اُن کی پاک دامنی اور نفسانی صفات و خصوصیات، دین اسلام اور شریعت حقہ کے قتل کا مرادف تھا اور اس سے بڑھ کر سید الشہداءؑ کی شکست کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

امامؑ کے لیے اپنے قتل کے بعد اس مقصد کی حفاظت کا کون سا ذریعہ تھا؟ کس پر وہ اعتماد کرتے کہ وہ اُن کی شہادت کے فلسفہ اور اُن کی حقانیت صداقت کی تبلیغ کے حق کو ادا کرے گا؟ کیا وہ اپنے اعزا، اور انصار پر بھروسا کرتے؟ وہ تو سب

اُن کے سامنے قتل ہو جانے والے تھے۔ کیا وہ بیمار فرزند زین العابدینؑ پر اعتماد کرتے؟ وہ تو خود طوق و زنجیر میں گرفتار اور شدائد مرض میں مبتلا تھے اور اُن کا قتل کرنا سخت دل دشمنوں کے لیے معمولی بات تھی، پھر کون تھا جو امامؑ کے بعد اس اہم فریضہ کا ذمہ دار ہو؟ کون دنیا کے سامنے حقانیت و صداقت کو بے نقاب کر کے دشمنوں کی حکمت عملی اور حیلہ سازی کو مکمل شکست دیتا اور بکھرے ہوئے مجمعوں میں، بازاروں کے اندر پُر زور و مدلّل تقریروں سے ناواقف افراد کے سامنے حقیقت کو واضح کرتا؟

اُس وقت کو دیکھیے اور اُن حالات پر غور سے نظر ڈالیے وہ ہولناک مواقع ایسے نہ تھے کہ کسی بڑے سے بڑے مرد کے قدم وہاں ٹھہر جاتے، فرض بھی کر لیائے کہ کوئی مسلمان اپنی جان پر کھیل کر اُس موقع پر کھڑا ہوتا تو کیا اُس کو اتنی مہلت بھی دی جاتی کہ وہ اپنے فرض کو ادا کر سکے؟ کون تھا جو حسینؑ کے مقصد کی تکمیل کرتا؟ بے شک اس مقصد کو پورا کیا تو اُن ہی بے والی و وارث عورتوں نے جو قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرائی جا رہی تھیں، جن کے دلوں میں غم و غصّہ کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کی رگوں میں علوی و فاطمی خون جوش کھا رہا تھا جن کی زبانوں سے نبوی بلاغت اور علوی فصاحت الفاظ کی

صورت میں موجزن تھی، اُنھوں نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے پُرجگر مردوں سے نہ ہوتا اور ایسے سخت مواقع پر فریضۂ تبلیغ کو ادا کیا جن میں بہادروں کے دل چھوٹ جاتے، فرزند رسولؐ کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے اور جتنے یگانے بیگانے آپ کے ساتھ ہیں سب شہید ہوں گے اور مردوں میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جو اسلامی افراد کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کر کے اُن کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹائے اگر آپ اس پہلو سے چشم پوشی کرتے اور اپنے بعد کے لیے اس مقصد کا کوئی سرانجام نہ کرتے تو یقیناً آپ کی قربانی غیر مکمل اور عبث رہتی اور اُس سے جو اصلی مقصد تھا وہ حاصل نہ ہوتا، اس نصب العین کی تکمیل کے لیے حضرتؑ کو مخدراتِ عصمتؑ کا اپنے ساتھ رکھنا ضروری معلوم ہوا۔

حضرتؑ کو اس امر کا احساس تھا کہ بنی اُمیّہ اسلامی احکام و قوانین اور عربی عادات و اخلاق سے جتنا بھی تجاوز کریں لیکن یہ نہیں ممکن کہ اُن کو بے والی و وارث عورتوں کے قتل کی ہمّت ہو، نہیں ممکن کہ وہ ایک مصیبت زدہ غم رسیدہ عورت کو قتل کریں جس کا قصور صرف اتنا ہو کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اُس نے کچھ الفاظ زبان سے نکالے ہوں۔ روزِ عاشورا اگرچہ دشمنوں کے ہاتھ سے بعض عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے لیکن معرکۂ جنگ کی خصوصیات دوسرے اوقات سے مختلف ہیں۔ ابن زیاد اپنے تمام ظلم و جور اور طغیان و سرکشی

کے باوجود ہرگز اس امر پر قادر نہ تھا کہ وہ غیر معرکہ جنگ میں ایک بے کس و بے بس عورت کا خون بہاتا جو اُس کے سامنے ایک قیدی کی صورت میں کھڑی ہو۔

ملکی قوانین کی شرما شرمی یا عوام کے جذبات کے خیال سے سہی لیکن وہ کسی عورت کو قتل کرنا تو در کنار ظاہر بظاہر ہاتھ بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا، چنانچہ جب مخدرۂ رسالت زینب کبریٰؑ نے اپنی باطل شکن تقریر سے اُس کے بلکہ تمام اموی حکومت کے کفر و فسق اور خبث و شقادت کو طشت از بام کر دیا اور ثکلتک امک یا ابن مرجانۃ کے تعریضیہ کلمہ نے دنیا کو اُس کی آنکھوں کے سامنے تاریک بنا دیا تو اُس نے چاہا کہ ہاتھ اٹھائے اور زینب کبریٰؑ سے اُن کے جگر سوز الفاظ کا بدلا لے لیکن اُسی کے لشکر کا بڑا سردار عمرو بن حریث سامنے آگیا اور اُس نے ابن زیاد کو یہ کہہ کر روک دیا کہ عورت کو اُس کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی سزا نہیں دی جاتی، ابن زیاد کو یہ کہہ کر ساکت ہو جانا پڑا کہ (اما تراھا کیف تجرّأت علیّ) تو دیکھتا نہیں کہ زینبؑ نے میرے ساتھ کتنی بڑی جسارت کی،

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ اور انصار حسینؑ نے کربلا میں وہ یادگار نمونہ پیش کیا جس کا مثل ناممکن ہے۔ اُنھوں نے شجاعت و جرأت کا مجسمہ بن کر ثبات قدم و استقلال کے وہ جوہر دکھلائے جن کی نظیر تاریخ کے صفحات پر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی، ستّر آدمی

ستر ہزار کے مقابل میں کھڑے ہوئے پھر اُن کو کوفہ وشام سے
برابر مدد پہونچنے کی توقع اور ان کو کسی امداد کی اُمید نہیں، و
نہر کے کنارے سیر وسیراب، اور یہ ریگستان میں تین دن کے پیاسے
آفتاب کی گرمی، لوہے کی تپش، زخموں کی کثرت آنکھوں کے سامنے
بچے پیاس سے جاں بلب ان تمام حالات کے باوجود پائے ثبات
میں تزلزل آنا توکیسا چہروں پر شکن کبھی نہ آنے پائی بلکہ جتنا وقت
زیادہ سخت ہوتا جاتا تھا اُن کے چہروں کی بحالی، رگوں میں خون کی
روانی، ارادوں کی پختگی زیادہ ہوتی جاتی تھی، یقیناً بڑا حیرت انگیز،
دہشت ناک موقع تھا جس میں ٹھہرنا ان ہی بہادروں کا کام تھا
لیکن اگر غور کیجئے تو اس سے زیادہ عظیم اور دہشت ناک وہ موقع
جہاں خاندان رسالتؐ کے مخدرات عصمت وطہارت کو ٹھہرنا پڑا تھا
اور وہ یزید و ابن زیاد کا دربار ہے۔

ذرا دیکھیے تو سہی! کوفہ میں قصر دار الامارہ کے اندر دربار
آراستہ ہے ابن زیاد تخت حکومت پر فتح وظفر کے نشہ میں سرشار
بیٹھا ہے، تمام ارکان دولت، روسائے قبائل، عمال حکومت
حاضر ہیں اور سامنے عام ملازمین بارگاہ صف در صف دم بخود
ایستادہ ہیں اس حالت میں اسرائے اہلبیتؑ اور سرہائے شہداء
لائے جاتے ہیں، ان ہی قیدیوں میں عقیلۂ حوراء زینب کبریٰ بھی
ہیں۔ اور وہ ایک گوشہ میں عام نظروں سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ جاتی

ہیں، ابن زیاد کی کمینہ نفسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ بلند ہمت فاتحین کی صورت سے دشمن پر ظفر پانے کے بعد معاف کر دے یا کریم النفس اور باوقار افراد کے طریقہ پر سکوت سے کام لے، اُس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی فتح و ظفر کا زبانی اظہار کر کے اُن دُکھے ہوئے دلوں کو اور دُکھائے۔ عظمت و جلالت چھپائے سے نہیں چھپتی اُس نے حضرت زینبؑ کو قرائن سے پہچانا اور ضرور پہچانا لیکن صرف بخیال خود ہتک حرمت کے لیے (جس کا نتیجہ خود اس کی سُبکی اور ہتک کی صورت میں ظاہر ہوا) پوچھنے لگا کہ یہ کون عورت ہے جو لوگوں کی نظر بچا کر دُور بیٹھی ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ زینبؑ دختر علیؑ ہیں! اب ابن زیاد کو اپنی فتح و ظفر کے مظاہرے اور زینبؑ کی شماتت اور دل آزاری کا موقع پیدا ہو گیا۔

ابن زیاد۔ کیوں زینبؑ؟ دیکھا خدا نے تمہارے بھائی اور اُن کے باغی ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس سوال کا جواب ایک ستم رسیدہ عورت جو قیدی کی صورت میں ہو کیا دے سکتی ہے؟ کیا اُس کے دل میں اتنی طاقت، زبان میں اتنی قوت باقی رہ سکتی ہے کہ وہ جواب سنجیدگی کے ساتھ دے لیکن ذرا ان لفظوں پر غور کیجیے جو زینب کبریٰؑ نے جواب کی صورت میں کہیں، ان میں کہیں اضطراب خوف، بے صبری، ناسمجھی کی جھلک ہے؟ "میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھا، یہ وہ لوگ تھے جن پر قتل ہونا خط تقدیر نے

لکھ دیا تھا، وہ اپنے پیروں سے اپنے مقتل کی طرف گئے اور و
دن دُور نہیں کہ جب خدا کے سامنے تیرا اور اُن کا مقابلہ ہوگا او
تجھ کو جواب دہی کرنا ہوگی اُس وقت دیکھنا کہ فتح کس کی ہے
زینبؑ کے یہ جملے معانی کا دفتر اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں
فلسفۂ مظلومیت کے تمام نکات واسرار ان چند کلموں میں مضمر اور
عقیدۂ معاد اور دارِ آخرت کی تبلیغ ان کا مخصوص جوہر ہے۔
ابن زیاد کے لیے سنجیدہ بحث کا دروازہ بند تھا، اُس کی
زبان رک چکی تھی اُس کی تمام ظاہری شان وشوکت، دولت و
ثروت ان الفاظ کا جواب دینے کے لیے کام آنے والی نہیں تھی اُس
کو سب وشتم اور عامیانہ گفتگو کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا۔
ابن زیاد۔ "خدا کا شکر کہ تم لوگوں کو قتل کیا، تمھیں رُسوا کیا اور
تمھاری باتوں کو جھوٹ ظاہر کر دیا۔" اس کے جواب میں کیا زینبؑ
بھی ایسی ہی غیر سنجیدہ اور انسانیت سے گری ہوئی تقریر کرتیں؟!
لا واللہ! زینبؑ کی شان اس سے ارفع و اجل تھی، وہ اس موقع
پر باطل کا مقابلہ حق سے، لغو باتوں کا جواب دلیل وبرہان سے دے
رہی تھیں اُنھوں نے کتنی شاندار لفظوں میں جواب دیا جن پر بلاغت
نثار ہو رہی ہے۔

"رُسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق ہو اور جھوٹ اُس کا کُھلتا ہے جس کو
سچّائی کا لحاظ نہ ہو اور وہ ہم نہیں ہمارا غیر ہے۔" حسینؑ وانصارِ حسینؑ

نے ظہرِ عاشور دشمنوں کا مقابلہ کیا، اُن کے ہاتھوں میں چلتی ہوئی تلواریں
تھیں، اُن کے دوش پر بارڈھ دار نیزے تھے، عزت اُن پر سایہ فگن
اور شرف اُن کے ہم رکاب تھا، ان میں سے ایک اُس وقت قتل ہوتا
تھا جب وہ دشمنوں میں سے سیکڑوں کو قتل کر لیتا تھا، وہ خوش
تھے، اُن کے لبوں پر تبسم تھا اس خیال سے کہ تھوڑی دیر میں وہ
دنیوی آلام سے نجات حاصل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت الفردوس
میں جا کر قیام کرنے والے ہیں۔ یہ اُس موقف کی صورت تھی جہاں
شہدائے کربلاؑ کو کھڑا ہونا پڑا تھا لیکن وہ موقع جو زینب کبریٰؑ
اور اُن کے ساتھ کی مخدرات عصمت کو برداشت کرنا پڑا اس
سے مختلف ہے، وہ دربار ابن زیاد میں قیدی کی صورت میں
کھڑی تھیں، وہ نظر اُٹھا کر جدھر دیکھتی تھیں سوا شماتت
کرنے والے دشمنوں اور ہنس ہنس کر طعن و تشنیع کرنے والے
اشقیا کے کوئی نظر نہ آتا تھا، اُن کی آنکھوں کے سامنے وہ جفاکار
اشخاص موجود تھے جن کی تلواروں نے اُن کے جوان فرزندوں،
بھائی بھتیجوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، وہ اپنے کو ایک ایسے
مقام پر قیدی کی صورت میں دیکھ رہی تھیں جہاں وہ ایک
وقت میں سلطنت کر چکی تھیں۔

یہ تمام باتیں وہ ہیں جو انسان کو بے قابو، عقل و حواس کو
مختل اور زبان و دل کو بے طاقت بنا دیتی ہیں، جن کی موجودگی

میں شجاع ترین انسان ایک کلمہ زبان سے کہنے کے قابل نہیں ہوا کرتا۔

زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کے ان خصوصیات و حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کسی شخص کو یہ کہنے میں جھجک ہو سکتی ہے کہ انھوں نے دربار ابن زیاد میں جس منزل کو طے کیا وہ اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھی جس کو انصار سیّد الشہداؑ نے کربلا کے میدان میں قطع کیا؟ تاریخی حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان طاقت رُبا اور ہمت شکن حالات کی موجودگی میں ابن زیاد کے سامنے زینبؑ کی زبان میں لکنت یا ان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب یا اُن پر کسی طرح کے خوف و دہشت کا اثر تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انھوں نے اس موقع پر ایسی پُرحقائق تقریریں کیں جن کو اگر ایک فارغ البال اور مطمئن شخص کئی رات دن کی فکر میں تیار کرتا تب بھی وہ اپنی نوعیت میں یادگار کی حیثیت نہ رکھتیں پھر جناب زینبؑ نے تو ہزاروں اشخاص کے مجمع میں ایسے موقع پر ان خطبوں کو ارشاد فرمایا تھا جب وہ مصائب اور شدائد کے بتیس ۳۲ دانتوں میں زبان کی طرح گھری ہوئی تھیں، جب کہ مظالم کی چکّی اُن پر چل رہی تھی اور اُن کی زندگی کا مشکل ترین موقع تھا آخر ابن زیاد نے جب پوری طرح سمجھ لیا کہ زینبؑ پر اس کی سطوت و شوکت کا ذرہ برابر اثر نہیں ہے

اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ ان کی باتیں رائے عامہ کو اُس کے خلاف منقلب نہ کر دیں اور اُس کی رُسوائی اور فضیحت میں نقاب خفا کے جو تھوڑے بہت تار باقی ہیں وہ بھی معدوم نہ ہو جائیں تو اُس کو تقریر کا رُخ بدلنا پڑا اور آخری لفظیں جو اُس کی زبان سے نکلیں وہ یہ تھیں (لعمری انھا لشجاعۃ ولقد کان ابوھا اسجع منھا) "خدا کی قسم زینبؑ بڑی عبارت آرائی کرنے والی ہیں۔ اور ان کے باپ تو ان سے زیادہ عبارت آرائی میں کامل تھے"۔

نہیں نہیں اے ابن مرجانہ! زینبؑ صرف عبارت آرائی کرنے والی نہیں ہیں۔ وہ ثبات استقلال کا مجسّمہ، حقانیت وصداقت کا پیکر ہیں وہ حکومت جابرہ اور سلطنت ظالمہ کے مقابل حق کی آواز بلند کرنے کی امانت دار ہیں، وہ علی بن ابی طالبؑ کی یادگار ہیں جنھوں نے دنیا کو فصاحت وبلاغت اور شجاعت وجرأت کا سبق دیا، وہ معصومۂ کبریٰ فاطمہ زہراؑ کی بیٹی ہیں جن کی عصمت و طہارت پر آیۂ تطہیر نے مُہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ نہ مرجانہ اور سمیہ یا ہند جگر خوارہ جن کے رُسوائے عالم واقعات سے تاریخ کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہے۔

زینبؑ کی یہ شجاعت وجرأت ایک مرتبہ دو مرتبہ سے مخصوص نہیں بلکہ اُس کا ظہور ہر اُس موقع پر ہوتا رہا کہ جب مشکلات کا ہجوم اور مصائب کا اژدہام تھا۔ جب کہ تماشائیوں سے بازار،

کوٹھے، برآمدے مملو تھے۔ کوفہ میں داخلہ کے وقت، کوفہ سے نکلنے کے موقع پر راستے میں، بازار شام کے اندر، ہر مناسب موقع پر زینبؑ کی زبان فریضۂ تبلیغ میں گویا تھی۔ انھوں نے حق کے واضح کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، انھوں نے ہر موقع پر ایسی تقریر کی جو کسی ایسے خطیب سے بھی ناممکن ہے جس کے لیے تمام خاطر جمعی اور راحت واطمینان کے اسباب موجود ہوں۔

قیدیوں کا قافلہ کوفہ میں پہونچا، اس صورت میں کہ جس سے پتھر کا دل بھی پگھل جائے، زنان کوفہ نے فطرتاً بے چین ہو کر رونا شروع کیا، سید سجادؑ نے ضعف و مرض کے باعث تھرّاتی ہوئی آواز میں کہا:-

"تم ہی لوگوں نے تو ہمارا خون بہایا اب تمہاری عورتیں ہمارے حال پر روتی ہیں، ہمارا تمہارا فیصلہ روز جزا خدا کے سپرد ہے"

پھر ذرا واقعہ کی دردانگیزی بڑھی اور مرد و زن ہم آواز ہو کر رونے لگے امامؑ نے فرمایا:-

"تم لوگ ہمارے لیے روتے اور نوحہ کرتے ہو پھر آخر ہم کو قتل کس نے کیا ہے؟"

بشیر بن خزیم اسدی ناقل ہیں کہ اس موقع پر زینبؑ بنت علیؑ نے مجمع کی طرف رخ کیا اور تقریر شروع کی۔ میں نے آج تک کسی پردہ نشین عورت کو اتنی پُرزور تقریر کرتے ہوئے نہ سنا تھا۔ گویا

علی بن ابی طالبؑ کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ اُنھوں نے لوگوں کی طرف سکوت کا اشارہ کیا جس کے ساتھ ہر طرف خاموشی چھا گئی، انھوں نے کہا:۔

"حمد کا مستحق خدا ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمد مصطفےٰؐ" اور اُن کی عترتؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اے اہل کوفہ، اے اہلِ مکر و دغا تم روتے ہو؟ خدا کرے ان آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور ان نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون نہ ہونے پائے (آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ فرمایا) کیا تم سچ مچ آنسو بہا رہے ہو اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ بے شک تم اسی کے مستحق ہو۔ جتنا ممکن ہو زیادہ روؤ اور ہنسی کو کم آنے دو تم سمجھے بھی کہ رسول خدا کے جگر کو کیسے تم نے چاک کر دیا اور اُن کے گھرانے کی کیسی عزیز خواتین کو تم نے بے پردہ کیا اور اُن کا کیسا خون تم نے زمین پر بہایا اور اُن کی کتنی بڑی ہتک حرمت تم نے کی؟ کیا تم کو اس بات پر تعجب ہے کہ آسمان سے خون برسا؟ یہ تو کچھ نہیں! آخرت کا عذاب بہت سخت ہے اور اُس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا اس چند روزہ مہلت کے زمانہ سے مغرور نہ ہونا، خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں، نہ موقع نکلنے کا خوف ہے، وہ یقیناً تمہاری تاک میں لگا رہے گا۔"

دانتوں میں اُنگلیاں دبائے ہوئے رو رہے تھے اور ایک بڈھے کو میں نے روتے ہوئے دیکھا وہ کہہ رہا تھا "میرے ماں باپ تم لوگوں پر نثار، تمہارے بوڑھے تمام دنیا کے بوڑھوں سے بہتر اور تمہارے جوان تمام جوانوں سے بہتر اور تمہاری عورتیں تمام عورتوں میں افضل و بہتر اور تمہاری نسل تمام جہان کی نسل سے بہتر ہے، نہ وہ کبھی ذلیل ہو سکتی ہے نہ رُسوا!"

پھر ام کلثومؑ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ کہا اور ان کے بعد فاطمہ بنت الحسینؑ نے تقریر کی (الحمد للّٰہ عدد الرمل والحصیٰ وزنۃ العرش الی الثریٰ الخ)

یہ اُس وقت کا تذکرہ ہے جب یہ قافلہ بے پردہ محمل و کجاوہ کے اندر کوفہ میں جا رہا تھا یا دربار ابن زیاد میں لایا گیا تھا، لیکن اب ذرا آگے بڑھ کر دربار یزید پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے یہ قافلہ اس دربار میں کس طرح لایا جاتا ہے؟

یزید سریر حکومت پر دو نشوں میں سرشار بیٹھا ہے۔ ایک نشۂ شراب دوسرے نشۂ فتح و ظفر اور اس کے گرد طواغیت بنی اُمیّہ و بنی عبدالشمس، ارکان دولت طلائی و نقرئی کرسیوں پر حریر و دیبا کے لباسوں میں ملبوس مجتمع ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں اور دولت و ثروت، طرب و نشاط کا نقشہ کھنچا ہوا ہے، اس حالت میں خاندان رسالتؐ کی عورتیں اور بچے رسیّوں میں بندھے ہوئے

دربار میں لائے جاتے ہیں، اُس وقت یزید کے مسرت ونشاط کا پارہ ذرا اور اونچا ہو جاتا ہے. اور وہ اس بات کی آرزو کرنے لگتا ہے کہ کاش جنگ بدر میں لشکر اسلام کے ہاتھوں سے قتل ہونے والے اُس کے بزرگ ہوتے اور وہ دیکھ لیتے کہ خاندان رسالت سے اُن کا بدلا کس طرح سے لیا گیا (لیت اشیاخی ببدر شہدوا الخ)

یہ موقع وہ تھا کہ معصومۂ صغریٰ زینب کبریٰ ؑ کھڑی ہوئیں اور وہ تقریر شروع کی جس نے یزید کے تمام جاہ جلال کی عمارت کو متزلزل کر دیا، ان الفاظ کو غور سے سُنئے اور دیکھیے، ان الفاظ اور ان کے معانی کی شان وشوکت اور پُر زور طاقت کس طرح یزید کو اُس کے تمام جبروت سمیت پر کاہ سے زیادہ بے وقعت ثابت کر دیتی ہے!!

زینب سلام اللہ علیہا کھڑی ہوئیں اور کہا:- "کتنا سچا ہے میرے پروردگار کا ارشاد (ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ أَسَاءُوا السُّوْأَى أَنْ كَذَّبُوْا بِآيَاتِ اللهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ) "آخر میں اُن لوگوں کی جنھوں نے بُرے اعمال کیے یہ نوبت پہونچی کہ اُنھوں نے آیات خدا کی تکذیب کی اور وہ اُن کی ہنسی اُڑاتے تھے۔" تو نے اے یزید کیا یہ گمان کیا کہ جب تو نے ہم پر زمین وآسمان کے تمام راستوں کو بند کر دیا اور ہماری حالت یہ پہونچی کہ تیرے سامنے قیدیوں کی طرح لائے جائیں تو اس سے خدا کی نظر میں ہماری حقارت اور تیری کچھ عزت ہو گئی اور یہ کہ تیری کامیابی تیرے

رفعت مراتب کے باعث تھی؟ اس خیال سے تیری ناک چڑھ گئی اور
تو خوش ہو ہو کر (غرور وتکبّر کے ساتھ) اپنے شانوں پر نظر ڈالنے لگا
جب تو نے دیکھا کہ دنیا تیرے حکم کی پابند اور امور مملکت منظم و
مرتب ہیں اور ہماری سلطنت و حکومت تیرے لیے تمام خطرات
سے صاف ہو گئی، کیا تو بھول گیا قول خدا کو کہ (نہ خیال کریں، وہ لوگ
جنھوں نے کفر اختیار کیا کہ ہم جو اُن کو مُہلت دیتے ہیں اس لیے
کہ وہ خوب دل کھول کر گناہ کریں اور آخر اُن کے لیے حقارت آمیز
سزا مقرر ہے) کیا انصاف کا اقتضا یہی ہے کہ تو اپنی عورتوں اور
کنیزوں کو تو پردے میں رکھے ہوے ہے اور دختران رسولؐ
کو قیدیوں کی صورت میں در بدر پھراتا ہے پھر اُس پر بڑی بے باکی
اور جرأت کے ساتھ کہتا ہے (لاھلّوا واستھلّوا فرحا) اگر
بدر میں مارے جانے والے بزرگ اس کو دیکھتے تو خوشی کے
مارے چیخ اُٹھتے۔

تو اپنے بزرگوں کو بخیال خود پکارتا ہے، گھبرا نہیں تھوڑے
ہی دن میں تو بھی اُسی گھاٹ پر پہونچے گا اور یقیناً اُس وقت
تو آرزو کرے گا کہ کاش تیرے ہاتھ شل اور زبان گنگ ہوتی اور
تو نے جو کچھ کہا اُس کو نہ کہتا اور جو کیا اُس کو نہ کرتا، تیرے لیے
اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خدا فیصلہ کرنے والا اور محمد مصطفےٰؐ
تیرے مقابل میں مدعی اور روح الامین اُن کی پشت پناہ اور

مددگار ہوں گے اُس وقت اُن لوگوں کو بھی جنھوں نے تیرے افعال کی تائید کی اور تیرا ساتھ دے کر مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کیا معلوم ہو گا کہ ظالمین کو کیسا بُرا بدلا دیا جاتا ہے۔"

کیا کسی مصوّر یا مضمون نگار کا قلم یزید کی حالت اور فتح و ظفر کے باعث اُس کے خوشی و نشاط اور غرور و تکبّر کی تصویر بر موقع اس موثر انداز سے کھینچ سکتا ہے۔ جس صورت سے زینب کبریٰؑ نے اس مختصر وقت میں کھینچی تھی؟ کیا کسی واعظ شیریں زبان اور مبلغ کی یہ طاقت تھی کہ وہ اس موقع پر یزید کے بڑھتے ہوئے سرکشی و تمرد کے پارے کو اس صورت سے گھٹاتا؟

کیا اپنے طاقت ور اور مالک تاج و تخت دشمن کے مقابل میں اپنی عظمت و جاہ و جلال کا بیان اس وقت پر ممکن تھا کہ جب ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے عزت و احترام کے تمام حیثیات مفقود اور ذلت و اہانت کے تمام اعتبارات موجود ہیں؟ یہ حق کی طاقت تھی جس نے اُس وقت یزید کے سر کو خم کر دیا۔ حضرت زینبؑ نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ چاہا کہ خود اُس کو اور اُس کے ہم نشین اہل دربار کو حق کا جاہ و جلال اور باطل کی سچی بے وقعتی اور کم قدری مجسم صورت سے دکھلا دیں اور یہ کہ کس طرح جوہر حقیقت کی مالک ہستیاں قوّت و سلطنت اور خوف و ہیبت کے اسباب کی طرف ذرّہ برابر پروا نہیں کرتیں۔ اُنھوں نے

چاہا کہ خود یزید کو اُس کی کم قدری اور بے حقیقتی، پست فطرتی اور بے بضاعتی حسب ونسب کی پستی کا احساس کرا دیں اور دکھلا دیں کہ وہ خود اس سے اجل وارفع ہیں کہ اس سے بات کرنا پسند کریں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اگرچہ انقلابات زمانہ نے یہ نوبت پہونچا دی کہ میں تجھ سے بات کر رہی ہوں حالانکہ میں تیری قدر و منزلت کو بہت کم جانتی ہوں اور تیری توبیخ وسرزنش کو اپنے لیے بڑی مصیبت سمجھتی ہوں لیکن کیا کروں کہ دل بھرا ہوا ہے اور کلیجہ میں آگ لگی ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ خداپرست افراد شیطانی لشکر کے ہاتھوں قتل ہوں!!!"

اس کے بعد حضرت زینبؑ نے چاہا کہ صریحی طور پر فلسفہ مظلومیت اور اُس کے نتائج اور ظاہری فتح میں شکست اور شکست میں فتح کا پہلو اور ظاہری اسباب کا انجام کی حیثیت سے معکوس نتیجہ واضح کر کے بیان کر دیں اور بتلا دیں کہ مقصد میں کامیابی اور نتیجہ کی خوشگواری اُن کے لیے تمام مشکلات کو آسان کیے ہوے ہے یہی وہ نکتہ ہے کہ جس کے بیان میں اہل قلم بسیط سے بسیط مضامین لکھتے ہیں اور جس پر حسینی سیاست کی حقانیت و صداقت کا دار و مدار ہے۔ فرماتی ہیں:۔ "اچھا (اے یزید تجھ کو قسم ہے) تو کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھ اور اپنی پوری کوشش کو صرف، اپنی تمام جد و جہد کو ختم کر دے لیکن (یاد رکھ) خدا کی قسم تو ہمارے ذکر کو محو، ہماری زندگی کو فنا نہیں کر سکتا

اور نہ ہمارے اصلی مقصد تک تو پہونچ سکتا ہے، اس واقعہ کا ننگ و عار تجھ پر قیامت تک باقی رہے گا اور تو کبھی اس کو دھو نہیں سکتا، تیری رائے یقیناً غلطی پر، تیرے ایّام زندگی بہت محدود۔ تیرے ارد گرد کا مجمع بہت جلد تتر بتر ہونے والا ہے، وہ دن بہت نزدیک ہے جب منادی کی آواز بلند ہوگی (اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ) شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے پیشرو بزرگوں کا انجام سعادت کے ساتھ اور ہمارے آخری بزرگ کا انجام شہادت و رحمت کے ساتھ مقرر کیا اور وہ ہمارے لیے کافی اور بہترین ناصر و معین ہے۔"

یہ مختصر اقتباسات تھے اُس طویل خطبہ کے جو بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے۔ اُس کے الفاظ کی طاقت اور عبارت کا لطف و انسجام ہماری اُردو زبان میں کہاں؟ ہم اُس کے معنوی مفاد کو اپنی لفظوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ اس تقریر کا ہر ہر فقرہ یزید کے لیے ہزار ہزار تلواروں اور نیزوں کے زخم سے زیادہ سخت تھا اور کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ خطبہ اور اس کے ایسے دیگر خطبے جن کو تاریخ نے ہم تک پہونچایا ہے یا نہیں وہ ہی ایسے پُر طاقت اسلحہ تھے جنھوں نے یزید اور بنی اُمیّہ کے تخت حکومت کو الٹ کر ان کو نیست نابود کر دیا۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ امام حسینؑ اور اُن کے انصار و اقارب کے قتل ہو چکنے کے بعد ان مخدراتِ عصمتؑ کا ایسے ایسے ہولناک موقعوں پر قیام اور اُن کے حقائق و واقعات سے مملو خطبے نہ ہوتے تو حسینؑ کا قتل بالکل بے اثر اور اُن کا خون رائیگاں ہو جاتا۔ نہ اسلامی دنیا میں اُس کی کوئی اہمیت ہوتی۔ نہ کسی کا

شخص میں جذبۂ انتقام پیدا ہوتا۔

اُن کا قتل بالکل عبداللہ بن زبیر اور اُس کے بھائی مصعب کے قتل کی صورت اختیار کر لیتا جس سے نہ کوئی مقصد حاصل ہوا نہ اُس کا بدلا لیا گیا لیکن حسینؑ کے قتل نے عالم اسلامی میں آگ لگا دی۔ اُن مخدراتِ عصمت کا قید سے رہا ہو کر مدینہ پہونچنا تھا کہ اموی سلطنت میں انقلاب کے اسباب پیدا ہونے لگے، کوفہ میں جمعیت توابین سلیمان بن صرد خزاعیؓ اور اُن کے ساتھیوں سے لے کر بعد کے واقعات سب اسی اثر کا نتیجہ تھے جو اہل حرمؑ کے ورود کوفہ کے بعد سے لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو گیا، یزید و ابن زیاد کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، اموی سلطنت نیست و نابود ہوئی اور اس طرح کہ قیامت تک کوئی اس کا نام لیوا پیدا نہ ہوگا حسینؑ بن علیؑ زندہ ہیں، اُن کی تحریک بھی قیامت تک زندہ ہے لیکن یزید و اعوان یزید فنا ہوئے اور اُن کے نام و نشان بھی ہمیشہ کے لیے محو ہو گئے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے سید الشہداؑ اہل حرمؑ کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور یہی وہ عظیم الشان سیاست اور انجام بینی تھی جس نے ایک مرتب و منظم سلطنت کی بنیادوں کو چند روز کے اندر متزلزل کر دیا۔

دنیا نے حسینؑ کو اب تک نہیں پہچانا ہے، وہ اُن کے تدبر اور سیاسی سوجھ بوجھ کو شبہہ کی نظر سے دیکھتی ہے، وہ اہل حرمؑ کے اس سفر میں اپنے ساتھ لانے کو ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتی ہے لیکن تاریخی حقائق میں غور و فکر ایسے اعتراضات کو یادر ہوا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

کربلا میں حسینؑ بن علیؑ کا طرز عمل عظیم حکم و اسرار کا سرمایہ دار تھا، دیکھنے کے لیے آنکھ اور سمجھنے کے لیے دل کی ضرورت ہے۔

ضمیمہ دوم

از

مورخ اسلام علامہ مولانا السید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامونپوری مدظلہ

ناظم دینیات شیعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۸۶

اہلِ حرمؑ کی رہائی

پورا سال اہلبیتؑ کو دمشق میں اسیری میں گذر گیا۔ یزید کا ارادہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کربلا کے اسیروں کو زندگی بھر قید کی سزا دی ہے۔ لیکن ملک کے ہر حصہ میں بے چینی نے یزید کی آنکھیں کھول دیں اور وہ پچھتانے لگا کہ اس نے یہ راہ کیوں اختیار کی، اہلبیتؑ کی تشہیر سے اسے گمان تھا کہ یہ ذلیل ہو جائیں گے اور دوسروں کے دل لرز جائیں گے اور سب خوف زدہ ہو کر حکومت کے غلام بن جائیں گے اور دوسری خواتین اور بیمار کربلاؑ کی آتشیں تقریروں نے یزید کے سکون واطمینان کی جنّت کو غم ورسوائی کے جہنّم میں ڈال دیا۔ دمشق کے قید کا زمانہ بیمار کربلاؑ کے لیے ایک سوہان روح کا زمانہ تھا۔ اسی عہد کا واقعہ ہے کہ منہال بن عمرو نے بیمار کربلا سے ملاقات کی۔ اس وقت امامؑ قید تھے۔ امامؑ نے فرمایا ہم ویسے ہی ہیں جیسے فرعون کے زمانہ میں بنی اسرائیل تھے۔ وہ ان کے بچّوں کو ذبح کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھ چھوڑتا تھا۔ عرب عجم کے مقابلہ میں یہ فخر کرتے تھے کہ وہ محمد عربیؐ ہیں اور قریش عرب کے مقابلہ میں فخر کرتے تھے کہ وہ محمدؐ قریشی ہیں اور ہم اہلبیتؑ قتل کیے گئے دربدر پھرائے گئے انا للہ وانا الیہ راجعون

(اثبات الوصیت مسعودی سنہ ۳۴۶ھ ص ۱۴۳، لہوف ابن طاؤس ص ۱۰۲، مثیر الاحزان ابن نما ص ۵۸)

اہل بیتؑ کے خوف کا یہ عالم تھا کہ دمشق کی سرکار سے وہ اس قدر غیر مطمئن تھے کہ قید خانہ سے تھوڑی دیر باہر بیمار کربلاؑ کی باتیں کرنا ثانی زہراؑ کے انتشار ذہن کا سبب ہو گیا۔

منہال کہتے ہیں کہ سید سجادؑ مجھ سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک خاتون ان کے پیچھے آ کھڑی ہو گئیں اور فرمایا بیٹا کہاں! امامؑ نے منہال کو فوراً چھوڑا اور ان کے ساتھ ہو گئے۔ منہال نے جب دریافت کیا کہ یہ کون خاتون تھیں تو انھیں بتایا گیا کہ یہ ثانی زہراؑ حضرت زینبؑ تھیں۔ (انوار نعمانیہ سید نعمت اللہ جزائری)

ملک کی بد دلی سے متاثر ہو کر یزید نے طے کیا کہ اسیران کربلا کو بلا کر رہا کیا جائے۔ بیمار کربلا کو بلا کر کہا کہ آپ کو رہا کیا۔ آپ کی مرضی پر ہے کہ خواہ دمشق میں قیام کریں خواہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ اسیران کربلاؑ نے کہا کہ دمشق سے رخصت ہونے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو اجازت دی جائے کہ امامؑ کی مجالس غم برپا کریں۔

یزید نے اجازت دے دی۔ ایک گھر خالی کرا دیا گیا۔ سب نے کالے کپڑے پہنے۔ شام میں جو قریش یا ہاشمی تھے مجلس ماتم داری و تعزیت سوگواری میں شریک ہوئے۔ یہ مجلس سات روز تک ہوتی رہی۔ ان مجلسوں کا تاریخی اثر بہت زیادہ ہے۔ مجلسی نظام جو ڈیڑھ ہزار سال سے ہمارے عقیدہ و ایمان و عمل کو تازہ زندگی بخش رہا ہے اس کی بنیاد انھیں ایام میں خود دشمن کے پایہ تخت میں ثانی زہراؑ اور بیمار کربلاؑ نے ڈالی۔

(بحار الانوار ج ۱۰)

یہ حبس مقاصد پر مبنی تھا اور اسیران کربلاؑ نے جس مقصد کو اپنی اسیری میں ملحوظ رکھا اس کو ہم پورے سال خصوصاً ماہ محرم میں مجلسوں میں پیش کرتے ہیں۔ سید الشہداؑ کے ساتھیوں نے اور بیمار کربلاؑ نے اور خواتین نے اپنی اپنی قربانیاں دینی بے داری اور عملی جوش کیلئے دی تھیں۔ دیانت اقتصاد۔ اجتماع۔ حمیت احترام۔ حمایت مظلومؑ ظالم سے نفرت استقامت و ثبات کی دولت ان مجلسوں میں تقسیم ہونا چاہیئے اور شہداؑ اور اسیرانِ کربلاؑ کی خدمات کا صحیح اعتراف یہی ہے کہ مجلسوں سے ذہنی تعمیر کے کام لیے جائیں

تبرکات کی واپسی کی خواہش

بیمار کربلاؑ نے اپنا لوٹا ہوا مال یزید سے مانگا۔ اس نے کہا کہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ امامؑ نے فرمایا ہمیں تمہارے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ لوٹ کے مال میں حضرت فاطمہؑ بنت محمدؐ کا چرخہ ہے۔ ان کا قلاوہ اور قمیص ہے۔ یہ چیزیں یزید نے واپس کر دیں دو سو دینار بھی دیئے اسے امامؑ نے اسی جگہ فقیروں میں تقسیم کر دیا۔

(لہوف ص۸۸)

شام سے کربلا کی طرف

قید سے رہائی کے بعد بجائے اس کے کہ بیمار کربلاؑ اور مخدرات عصمت سیدھے مدینہ روانہ ہوتے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ پہلے ہم کربلا جائیں گے وہاں سے مدینہ جائیں گے۔ جناب جابر عبداللہ انصاریؓ (جناب رسول خداؐ کے وفادار مخلص و عاشق صحابی تھے اور کافی معمر ہو چکے تھے) سید الشہداؑ کی قبر کی زیارت کے لیے کربلائے معلّیٰ

آرہے تھے۔ یہی زمانہ بیمار کربلاؑ کے کربلا پہونچنے کا تھا۔

علامہ ابن طاؤس لہوف میں لکھتے ہیں ص۸۸ (جب حسینؑ کی عورتیں اور عیال شام سے عراق پہونچے تو ان لوگوں نے رہنما سے کہا کہ ہمیں کربلا کی طرف سے لے چلو۔ یہ لوگ قتل گاہ پر پہونچے اس جگہ حضرت جابر عبداللہ انصاریؓ اور بنی ہاشم کی ایک جماعت اور آل رسولؐ کے کچھ مردوں سے ملاقات ہوی۔ ان سب نے مل کر قبر امامؑ پر نوحہ و ماتم کیا کہ قرب وجوار کی عورتیں بھی ماتم میں شریک ہوگئیں یہاں کئی روز قیام رہا۔ (اللہوف ص۱۸۸)

بعض دوسری کتابوں میں کہا گیا ہے کہ تین روز کربلا میں قیام رہا۔ اسی کربلا میں پہلی بار بیمار امامؑ اور مخدرات عصمت کا ورود ہوا تھا اور عزیز و اقارب و احباب سب حفاظت کے لیے موجود تھے پھر کربلا میں شہید ہوتے ہوے دیکھا، آج ان کی قبروں کے نشان دیکھے۔

واقعہ کربلا کے سلسلہ میں علمی تحقیقات پر کم توجہ کی گئی اس کے حزنیہ پہلو سے تو عوام و خواص علماء و محققین سب ہی متاثر ہوے لیکن بڑی ہی عقلوں نے اس کے اختلاف روایات کو دور کرنے کے لیے محنت و مشقت نہیں کی۔ انہی الجھے ہوے مسائل میں اسیران کربلاؑ کی رہائی اور کربلا میں دوبارہ آمد کا مسئلہ ہے۔ ایرانیوں خصوصاً ہندوستانیوں کے لیے کسی قدر یہ عذر قابل قبول ہے کہ

ان کے سامنے عراق کا مفصّل جغرافیہ نہیں ہے، جس سے طے کیا جائے کہ اسیران کربلاؑ شام کس راستے سے گئے تھے اور یہ راستہ کتنے دنوں کوفہ سے شام تک طے ہوتا تھا اور دوبارہ کربلا کس سال اور تاریخ میں واپس ہوئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کربلا میں یہ واپسی ۶۱ھ میں صفر کو ہو گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ عمر بن سعد کربلا سے ۱۱ر محرّم کو کوفہ روانہ ہو گیا۔ ۱۲ر محرّم کو اہل بیتؑ کوفہ میں پہونچ گئے ۱۳ر کو قافلہ دمشق چلا اور ۱۳ دن میں دمشق پہونچ گیا۔ یعنی ۲۶ر محرّم کو دمشق میں پہونچا۔ اس کے بعد روایتیں ہیں کہ اہل بیتؑ ۶ دن دمشق میں رہے یعنی ۳ر صفر کو دمشق سے کربلا کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسی طرح کربلا میں ۱۷ر صفر کو پہونچ گئے۔ تین دن جو بچتے ہیں یا تو ان میں کا کوئی حصّہ کہیں زیادہ صرف ہوا یا کوفہ اور دمشق میں ایک ایک دن زیادہ قیام کیا گیا۔ (شہید اعظم ریاض بنارسی مرحوم ص ۱۲۹/۲)

کوئی صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲ر محرم ۶۱ھ کو یہ قافلہ کوفہ پہونچا۔ ایک ہفتہ کوفہ میں قیام ہوا۔ نو روز میں کوفہ سے شام تک راستا طے کیا۔ یکم صفر ۶۱ھ کو قافلہ دمشق پہونچ گیا۔ ایک ہفتہ دمشق میں ۶۔۱۰ اداری کی ۱۳ روز میں واپسی ہوی، اربعین ۶۱ھ کو رہا ہو کر کربلا میں دوبارہ واپس آگئے۔

مولانا حاجی شیخ عباس قمی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں ہیں جن کی نظر واقعۂ کربلا پر فاضلانہ ہے۔ ان کے اُستاد علامہ نوری نے واقعۂ کربلا

میں تحقیقات علمی کا دروازہ کھولا اور شیخ عباس قمی بھی اس مسلک پر چلتے رہے۔ موصوف لکھتے ہیں اہلبیتؑ کا ۲۰ صفر ۶۱ھ کو کربلا واپس آنا بہت مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ کسی فن حدیث کے ماہر اور معتبر اہل سیر وتاریخ نے مقاتل وغیرہ میں یہ نہیں لکھا ہے کہ اہل بیت کا ورود کربلا میں ۲۰ صفر کو ہوا۔ (منتہی الآمال صفحہ ۲۴۱ شیخ عباس قمی)

لوط بن یحییٰ ابو مخنف نے کوفہ سے شام تک اسیران خاندان رسالتؐ کا جو راستہ بتایا ہے وہ ۱۴۳۰ میل ہوتا ہے۔

ابو مخنف نے اس روایت کو سہل شہرزوری سے لیا ہے جو کوفہ میں دمشق تک قافلۂ اہل بیتؑ کے ساتھ تھے۔ امام زین العابدینؑ کی وہ روایت بھی سنہ ۶۱ھ میں واپسی کی مزاحم ہے جب حضرت نے قید خانہ دمشق کا حال بیان فرمایا ہے کہ اس قید خانہ پر چھت نہ تھی اور ہم لوگ گرمی وسردی سے محفوظ نہ تھے۔ اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اسیران محمدؐ پر سردی کا زمانہ بھی شام میں گذرا اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسیران اہل بیتؑ کی رہائی سنہ ۶۲ھ میں ہوئی اور سنہ ۶۲ھ میں یہ قافلہ کربلا ہوتا ہوا مدینہ منورہ پہونچا ہے۔

بیمار کربلاؑ مدینہ میں

ایک دن سید سجادؑ مدینہ سے اپنے باپ، چچا، بھائیوں اور بہنوں، بھتیجوں کے ساتھ مدینہ سے نکلے تھے اور واپسی میں مردوں میں سوا سید سجادؑ کے اور بعض بہت کم سن بچوں کے اور خواتین کے کوئی بھی نہیں ہے۔

سب کو کربلا کی زمین میں سونپ دیا۔ اس وقت بیمار کربلاؑ اور مخدرات عصمت کے جو جذبات اور احساسات ہوں گے ان کا اندازہ ہمارے بس سے باہر ہے جب بیمار کربلاؑ مدینہ منورہ کے قریب پہونچے تو سواریوں کو ٹھہرانے کا حکم دیا۔ بیمار کربلاؑ اور مخدرات عصمتؑ سب اُتر پڑے، خیمے لگائے گئے بشیر بن جذلم سے بیمار کربلاؑ نے فرمایا تمہارے باپ شاعر تھے تمھیں بھی شاعری سے دلچسپی ہے؟ بشیر نے کہا میں بھی شاعر ہوں۔ امامؑ نے فرمایا ابو عبداللہ الحسینؑ کی سنائی سنا دو۔ بشیر مسجد رسولؐ کے پاس آئے اور روتے ہوئے بلند آواز سے دو شعر پڑھے۔ جن کا مطلب یہ تھا کہ مدینہ والو مدینہ رہنے کی جگہ نہیں رہی۔ حسینؑ قتل ہو گئے، میرے آنسو رواں ہیں۔ ان کی نعش کربلا میں چھوڑ دی گئی اور ان کے سر کی نیزہ پر تشہیر ہوی۔ بیمار کربلاؑ نے زندگی کا نیا دور شروع کیا۔ سجادہ پر قیام ساتھ قوت برداشت اور برائی سے انکار کے ساتھ احساس کمتری عزم کی شکست کا شائبہ نہ پیدا ہونے دیا، یہ بیمار کربلاؑ کا ایسا کارنامہ جس کی تاریخ انسانی میں مثال نہیں ہے۔ ان کے گریہ اور ان کی آہ اور کراہ میں قوت اور مردانہ پن اور اولوالعزمی ہے۔ بیمار کربلاؑ کی آنکھ نے درد مناظر کی جو تصویریں دیکھی تھیں ان کا رنگ کبھی میلا نہیں ہوا۔ باپ، چچا، بھائیوں، عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ وحشیانہ قتل اور اہل حرم کی اسیری کا وہ زندگی بھر ذکر کرتے رہے کہ انسانیت اب دوبارہ اپنی پستی میں گرنے سے بچے۔ بنی اُمیّہ کی انتہائے رذالت و کمینگی اور اسلام دشمنی